بلوچستان اور برطانوی مؤرخین

ڈاکٹر فاروق بلوچ

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ
عدالت روڈ، کوئٹہ

(c) All rights are reserved.

اے کتاب ءِ درائیں حقّ گوں بلوچی اکیڈمی ءَ انت۔

بیدءِ بلوچی اکیڈمی ءِ رضاءَ کسّ ایشی ءِ مواداں چاپ کُت نہ کنت۔

بلوچستان اور برطانوی مؤرخین

(تاریخ)

ڈاکٹر فاروق بلوچ

2018ء

ISBN # 978-969-680-047-7

نہاد:۔ 150/=

بلوچی اکیڈمی ءَ اے کتاب ذکی پرنٹنگ پریس کراچی ءَ چاپ کتگ۔

فہرست

عنوان | صفحہ نمبر

حرفِ اوّل 4

بابِ اوّل

بلوچستان جغرافیائی کیفیت (ایک تعارف) 8

باب دوئم

برطانوی جاسوسوں کی آمد سے قبل بلوچستان کے سیاسی حالات... 17

باب سوئم

برطانوی جاسوسوں کی آمد اور ان کے مقاصد 33

باب چہارم

برطانوی جاسوسوں کی آمد کے اثرات 75

حرفِ آخر 99

کتابیات 108

حرفِ اوّل

زیرِنظر تحقیقی کتاب ایک ایسے موضوع کے بارے میں ہے کہ جس کو اب تک علیحدہ موضوع کے طور پر زیر تحریر نہیں لایا گیا مگر سیاسی و تاریخی موضوعات اور خصوصاً بلوچستان کے بارے میں مباحث کے دوران اکثر اس موضوع کا نہ صرف تذکرہ کیا جاتا ہے بلکہ اس کی روشنی میں بلوچستان پر برطانوی قبضے کی تاریخ دیکھی جاتی ہے۔اس کتاب کا عنوان ''بلوچستان اور برطانوی مؤرخین'' ہے۔

مورخین اکثر وبیشتر انگریزوں کی آمد اور ان کے مقاصد کو زیر تحریر لاتے ہیں اور اس موضوع پر تصنیفات رقم کرتے ہیں مگر کبھی ان سیاسی وفوجی قبضہ گیروں کے لئے راستہ ہموار کرنے اور ان کے قبضے کو مستحکم کرنے والے جاسوسوں کے مقاصد پر الگ موضوع کے طور پر بحث کرنے اور تصنیفات رقم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ۔وہ حضرات جو ان جاسوسی مہمات کے لئے آمادہ ہوئے اور بعدازاں انہوں نے بلوچستان کے مختلف خطوں کی سیاحت کی۔ انہوں نے انتہائی اہم معلومات اپنی حکومت کو بہم پہنچائیں اس سے قطعہ نظر کہ انہوں نے اس خطہ پر اپنی افواج کے قبضہ کو ممکن بنانے کے لئے سب سے اہم ترین کام کیا اور بلوچستان سمیت ایک وسیع خطہ زمین کو ان کے آزاد وخود مختار باسیوں سمیت غلام بنایا، ان کے اس جذبے کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ایک ایسے خطے کی سیاحت کی کہ جس کی وسعتوں میں آج کے اس جدید دور میں بھی سیاحت کرنا آسان کام نہیں ہے چہ جائیکہ آج سے دوسوسال قبل اس خطے کی سیاحت کرنا۔مگر ان جاسوسوں اور ایجنٹوں کی ہمت کی داد دینی پڑے

گی کہ جنہوں نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر اس دشت وبیابان کی پوری مقصدیت کے ساتھ سیاحت کی اور برطانوی قبضے کے لئے راہ ہموار کی۔

ایسی لاتعداد کتابیں ہیں کہ جن میں ان مہم جوؤں کی مہمات کی تفصیلات ملتی ہیں ان میں سے کچھ ان کی اپنی تحریریں ہیں جبکہ بعض دیگر مورخین نے اپنی کتابوں میں ان کا ضمناً ذکر کیا ہے مگر اس کے باوجود ان کے آنے کے اصل مقاصد پر الگ سے کوئی تحقیقی تحریر نہیں ملتی جب کہ اس کی تعلیمی و تحقیقی مقاصد کے لئے اشد ضرورت بھی ہے یہ موضوع بلوچستان یونیورسٹی کے کئی شعبہ جات مثلاً بلوچستان سٹڈی سینٹر، پاکستان سٹڈی سینٹر، شعبہ تاریخ، شعبہ براہوئی اور شعبہ بلوچی میں امتحانی مقاصد کے لئے پڑھایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس موضوع پر اتنا مواد ہو کہ جس سے نہ صرف ایم اے کے طالبعلم استفادہ کرسکیں بلکہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والے سکالر بھی اس سے مستفید ہوسکیں۔

زیرِ نظر موضوع کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں بلوچستان کی جغرافیائی وعلاقائی کیفیت وسیاسی تاریخ کا مختصر تعارف شامل ہے جبکہ باب دوئم میں برطانوی جاسوسوں کی آمد سے قبل بلوچستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب سوئم بلوچستان میں برطانوی جاسوسوں کی آمد اور ان کے مقاصد پر مشتمل ہے یعنی جن مقاصد کے حصول کے لئے وہ مہم جوئی کرتے رہے وہ مقاصد کیا تھے اور کیا انہیں اپنے مقاصد کے حصول میں کامیابی حاصل ہوئی؟ باب چہارم میں انگریز جاسوسوں کے مقاصد کے نتیجے میں جو اثرات بلوچستان پر مرتب ہوئے اور جس طرح یہاں سیاسی، معاشرتی، معاشی اور لسانی ابتری پھیلائی گئی ان کا جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ باب انگریزوں کی توسیع پسندانہ پالیسی برائے بلوچستان کا احاطہ کرتا ہے۔ آخری باب یعنی باب پنجم نتیجہ بحث پر مشتمل ہے۔

اس موضوع کے آغاز سے انجام تک کتابوں کی نایابی آڑے آئی مگر کوشش وجستجو نے اس مرحلے میں مشکل کشائی کی اور اللہ کے کرم اور دوستوں کے تعاون سے یہ مرحلہ باآسانی طے پایا۔

اس کتاب کی کامیابی کے ساتھ تکمیل پر میں اپنے احباب میں سے جناب وحید رزاق ریسرچ آفیسر براہوئی زبان وادب بلوچستان سٹڈی سنٹر جامعہ بلوچستان کوئٹہ، جناب خالد رضا مینگل لائبریرین بلوچستان سٹڈی سنٹر جامعہ بلوچستان کوئٹہ، جناب اکبر ساسولی تجزیہ نگار ومترجم فارسی وادرو، جناب ناطق سولنگی چیف ایڈیٹر تہذیبِ بلوچستان (کچھی) جناب عبدالوحید بلوچ نیشنل بنک آف پاکستان، جناب یوسف علی رودینی پروفیسر پاکستان سٹڈی سنٹر جامعہ بلوچستان کوئٹہ، جناب ظاہر مینگل پروفیسر پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ جامعہ بلوچستان کوئٹہ، جناب محمد پناہ بلوچ جنرل سیکریٹری بلوچی اکیڈمی، جناب عبدالواحد کھیتران ریسرچ سکالر بلوچستان سٹڈی سنٹر اور ڈسٹرکٹ پروگرام منیجر این سی ایچ ڈی بارکھان کا بے حد شکر گذار ہوں کہ جو اپنی ذاتی مصروفیات چھوڑ کر اس موضوع کی تکمیل کے لیے مجھے اپنا قیمتی وقت دیتے رہے۔

ہمیشہ حوصلہ افزائی، رہنمائی اور قیمتی آرا سے مستفید کرنے پر میں شکر گزار ہوں اپنے خیر خواہوں اور دوستوں وائس چانسلر یونیورسٹی آف میرین سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی اوتھل لسبیلہ جناب ڈاکٹر گل حسن بلوچ صاحب اور رجسٹرار بلوچستان یونیورسٹی آف انجینئرنگ ٹیکنالوجی خضدار جناب شیر احمد قمبرانی صاحب کا، کہ جنہوں نے ہمیشہ میری نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ میری کاوشوں کو سراہا اور میری ہمت افزائی کے ساتھ ساتھ اپنے قیمتی مشوروں سے بھی مستفید کرتے رہے۔

کتاب کی پروف اور اغلاط کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اپنے قیمتی آراء سے مستفید کرنے پر میں تہہ دل سے مشکور ہوں جناب ڈاکٹر خالد خان خٹک صاحب چیئرمین

شعبہ اردو جامعہ بلوچستان کوئٹہ کا کہ جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے اپنا قیمتی ترین وقت میرے کام کو دیا۔ یقیناًان کا تعاون میرے لیے رہنمائی کا بڑا ذریعہ ہے۔

اپنے مرحوم استادِ محترم جناب عبدالوہاب شاہ سابقہ پروفیسر ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کا ہمیشہ مشکور و ممنون رہونگا کہ جنہوں نے مجھ ناچیز کو ہمیشہ اپنے دل اور دعاؤں میں جگہ دی۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر وائس چانسلر تربت یونیورسٹی کیچ مکران ، وہ ہستی ہیں کہ جنہوں نے مجھے اپنے عمل و کردار، محنت و جستجو اور محبت وایثار سے ہمیشہ متاثر کیا اوران کی ہی رہنمائی نے مجھے علم و تحقیق کے راستے پر گامزن کیا اور ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ میری کوئی بھی تحریر ان کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہوگی۔

زیرِ نظر دلچسپ اور انوکھا موضوع قارئین کی خدمت میں حاضر ہے جو یقیناًان کی تشنہ لبی دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

والسلام

فاروق بلوچ

روم نمبر 23، میل ٹیچر ہاسٹل،

جامعہ بلوچستان۔ کوئٹہ

باب اوّل:

بلوچستان جغرافیائی کیفیت
(ایک تعارف)

بلوچستان ایک وسیع وعریض خطہ زمین ہے جو وسط ایشیاء جنوب مغربی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے عین نکڑ پر واقع ہے۔قومی ونسلی حوالے سے اس قطعہ ارضی کا کل رقبہ تو 6 سے 7 لاکھ مربع میل تک پھیلا ہوا ہے کہ جہاں تک بلوچ آباد ہیں مگر سیاسی وجغرافیائی حوالے سے اس کا کل رقبہ بیان کرنے میں مورخین وماہرین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

اکثر مورخین جن میں عنایت اللہ بلوچ اور محمد سردار خان قابل ذکر ہیں بلوچستان کا کل رقبہ 3,40,000 مربع میل بیان کرتے ہیں۔(1) موجودہ وقت میں یہ رقبہ تین مختلف ممالک ایران افغانستان اور پاکستان میں منقسم ہے جبکہ پاکستانی حصے کے بھی بعض علاقے مثلاً کراچی ، جیکب آباد (خان گڑھ) شکار پور سندھ میں، ڈیرہ غازی خان، راجن پور اور کوہ سلیمان کا ایک وسیع حصہ پنجاب میں جبکہ ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے کلاچی اور اتالا تک صوبہ خیبر پختونخواہ میں شامل ہیں۔یہ وسیع وعریض خطہ مختلف اقسام کی طبعی کیفیت کا حامل ہے جو اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔اس کا زیادہ تر حصہ تقریباً 60 سے 70 فیصد اونچے نیچے پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے۔بلند ترین پہاڑی سلسلے 12 ہزار فٹ سے 5000 فٹ جبکہ نشیبی پہاڑی سلسلے 5000 سے 1200 فٹ

تک بلند ہیں۔ سبی، کچھی، بیلہ اور دشت مکران کے علاقے میدانی جبکہ خاران اور چاغی ریگستانی علاقے ہیں، کچھ پہاڑی سلسلوں میں گھنے جنگلات بھی ہیں مگر کافی حد تک کم۔ زرغون، ہربوئی اور خواجہ عمران کے پہاڑی سلسلوں میں جنگلات اور گھاس سے بھری ہوئی وادیاں ہیں جہاں سارا سال بلوچ چرواہے اپنی بھیڑ بکریاں چراتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں کوہ سیاہان، کوہ وسطی مکران، ساحلی مکران' کوہ پب، کوہ کیرتھر، کوہ سلیمان وغیرہ کے مشہور پہاڑی سلسلے بھی اسی خطے کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کچھی کا علاقہ تو ماضی قدیم سے زرخیز و آباد چلا آرہا ہے مگر لسبیلہ اور دشت مکران کے وسیع میدان آہستہ آہستہ ویرانی سے ہریالی میں تبدیل ہورہے ہیں۔ چاغی، نوشکی اور خاران کے علاقے ریگستانی ہیں۔ یہاں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے اور گڑھے عام طور پر ملتے ہیں جو بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ دراصل دشت لوط ہی کا حصہ ہیں جہاں سارا سال ریت کا سفر جاری رہتا ہے۔ یہاں ایک ہوا چلتی ہے جسے بادِ صد وبیست روز(ایک سو بیس دن یعنی چار مہینے چلنے والی ہوا) (2) کہتے ہیں۔ ان ہواؤں کے چلنے کے دوران ان صحرائی خطوں میں سفر کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کیونکہ اس دوران ریت کے مہیب پہاڑ تیز جھکڑوں کی وجہ سے شدید شکست وریخت سے دوچار ہوتے ہیں اور گہرے گڑھے یا ریت کے گہرے کنویں بھر جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے گڑھے بن جاتے ہیں اس دوران جب ہوا چلتی ہے اور ریت اڑتی ہے تو بعض اوقات حد نظر صفر ہوجاتی ہے اور تیز ہواؤں اور جھکڑوں کی وجہ سے آگے چلنا ناممکن ہوجاتا ہے اور بسا اوقات انسان اور جانور سبھی ریت کے سمندر میں دفن ہوجاتے ہیں۔

ان پہاڑی سلسلوں ،دشتوں اور میدانوں میں کئی اقسام کے جانور اور پرندے ملتے ہیں جن میں لگڑ بھگڑ ،بھیڑیے،لومڑی ، گیدڑ ،خرگوش،جنگلی کتے ، کئی اقسام کے دیگر گوشت خور جانور ، جنگلی بکرے ، ہرن، غزال اور کئی اقسام کے پرندے شامل ہیں ۔چلتن نیشنل پارک اور ہنگول نیشنل پارک میں درج بالا جانور اور پرندے عام طور پر نظر آتے ہیں جبکہ دریجی ، وڈھ، سارونہ ، خضدار اورلسبیلہ کے کئی پہاڑی علاقوں کو مقامی طور پر تحفظ دیگر جانوروں کے لئے پناہ گاہیں بنائی گئی ہیں جبکہ زیارت ، کوہ سلیمان کے گھنے جنگلات اورلسبیلہ کے ہنگول پارک میں چیتوں کی بھی موجودگی کی تصدیق ہوئی ہے ۔

بلوچستان کا ساحل ایک طویل مسافت پر مشتمل ہے۔ساحلی علاقہ ایران اور پاکستان میں تقسیم ہے جبکہ پاکستان میں بھی کچھ حصہ صوبہ سندھ میں شامل ہے۔ یہ کل ساحل کراچی سے میناب (بندر عباس کے قریب ایک بندرگاہ) تک پھیلا ہوا ہے۔اس کی طوالت کے بارے میں ماہرین میں اختلافات پائے جاتے ہیں ۔ ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ اور بعض دیگر مستند مورخین اس ساحل کی طوالت 600 میل رقم کرتے ہیں ۔ (3) جن میں سے 771 کلومیٹر یعنی 454 میل پاکستانی بلوچستان میں شامل ہے جبکہ 146 میل ایرانی بلوچستان میں واقع ہے ۔ اس کے علاوہ چند میل کی طوالت سندھ میں شامل کی گئی ہے ۔ خوردنی اور دیگر مچھلیاں، جھینگے ،سبز کچھوے اور دیگر آبی حیات اور سمندری پرندوں کی لاتعداد اقسام ملتی ہیں، ساحلی علاقہ زیادہ تر بے ترتیب اور کٹا پھٹا ہے مگر بعض مقامات پر ساحلی ٹاپو اور جزیرہ نما پائے جاتے ہیں کہ جہاں آسانی کے ساتھ بڑی بندرگاہیں بنائی جاسکتی ہیں ایسا ہی ایک میگا پروجیکٹ گوادر میں مکمل کیا گیا ہے کہ جہاں بڑے بحری جہاز آ کر لنگر انداز ہوتے ہیں ۔

بلوچستان کے وسیع وعریض خطے میں جہاں موسموں اور زمین کی طبعی ساخت میں فرق ہے اسی طرح پانی کے ذخائر بھی مختلف ہیں مگر بحیثیت مجموعی پانی کا کوئی باقاعدہ ذریعہ مثلاً دریا، نہر وغیرہ کہ جس سے وسیع پیمانے پر زراعت کی جا سکے نہیں ہے البتہ کچھی کا میدانی علاقہ دریائے بولان، ناڑی وغیرہ کے پانی سے سیراب ہوتا ہے ۔ کافی زمین پٹ فیڈر کینال، کیرتھر کینال اور ربیع کینال سے پانی حاصل کر کے زرخیزی پھیلاتی ہیں مگر اس کے باوجود بلوچستان میں کوئی باقاعدہ دریا جو سارا سال بہتا ہو، نہیں ہے لہٰذا جن علاقوں میں پانی کی قلت ہے وہاں زمین دوز نالیوں یعنی کاریزات کے ذریعے آبپاشی کی جاتی ہے یا پھر باران رحمت کا انتظار کیا جاتا ہے ۔ مشہور دریاؤں میں دریا بولان ، دریا مولہ ، دریا ناڑی ، دریا کیچ ، دریا نہنگ ،شادی کھور ،دریا رخشان ،دریا بڈو دریا حب ،دریا پب ، کوئٹہ ندی ،دریا ژوب ،دریا پورالی ،دریا ہنگول وغیرہ زیادہ قابل ذکر ہیں۔ان دریاؤں میں سارا سال پانی دستیاب ہوتا ہے البتہ بارانی دنوں میں ان دریاؤں میں شدید طغیانی آتی ہے جس سے بعض اوقات نشیبی علاقوں میں شدید تباہی مچ جاتی ہے۔ ہامون ماشکیل، زنگی ناوڑ، سرندہ جھیل، ہنہ جھیل، سپین کاریز پانی کی جھیلیں ہیں جن میں کچھ قدرتی اور کچھ مصنوعی ہیں۔ان جھیلوں پر سردیوں اور گرمیوں میں ہر قسم کے آبی پرندے ملتے ہیں جنکا بیدردی کے ساتھ شکار کیا جاتا ہے ۔ پھلوں کے لحاظ سے بلوچستان دنیا کا خوش قسمت خطہ ہے یہاں موسموں کی تنوع اور زمینی ساخت میں تبدیلی کی وجہ سے ہر موسم اور ہر خطے کے پھل ملتے ہیں۔ یہاں سرد، گرم، معتدل، میدانی، ریگستانی، ساحلی اور پہاڑی ہر قسم کے خطوں کے پھل، سبزیاں، دالیں و اناج اگتے ہیں۔ بلوچستان کی کل آبادی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق لگ

بھگ 69لاکھ ہے۔ مگر درحقیقت یہ اعداد سرکاری خانہ پُری تھی وگرنہ بلوچستان کے دور دراز اور ناقابل گزر علاقوں کے لوگ اس میں شامل ہی نہیں ہیں اندازاً بلوچستان کی آبادی ڈیڑھ سے دو کروڑ کے مابین ہے اور موجودہ دور میں یہ تعداد زیادہ بڑھ گئی ہوگی بلوچستان کی نوے فیصد آبادی بلوچ قبائل پر مشتمل ہے جو مشرق' مغرب، جنوب اور وسط میں آباد ہیں جبکہ شمال میں زیادہ تر پشتون قبائل ہیں جن کی اکثریت پاکستان بننے کے بعد افغانستان کے نامساعد حالات سے تنگ آ کر مہاجرت کر کے بلوچستان میں آ کر آباد ہوئی۔ پاکستان میں شامل بلوچستان 32اضلاع اور 6 کمشنریوں پر مشتمل ہے۔ یہاں اکثریت بلوچی زبان بولنے والوں کی ہے اور کئی لہجوں مثلاً براہوئی، جٹکی، سرائیکی اور دہواری میں بات کرتے ہیں جبکہ پشتو صوبے کے شمال میں بولی جاتی ہے۔

بلوچستان گو کہ پاکستان کا دورافتادہ علاقہ ہے اور یہاں باقی ملک کی نسبت کوئی ترقی نہیں ہوئی مگر سیاسی وجغرافیائی حوالے سے اس خطے کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ بلوچستان کی جغرافیائی اہمیت ماضی قدیم سے مسلم چلی آرہی ہے اور تاریخ کے تمام ادوار میں اس خطے نے اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ بلوچستان میں پائے جانے اور دریافت کئے جانے والے آثار قدیمہ بلوچستان کے تہذیبی سفر کو 11ہزار سال ماضی میں لے جاتے ہیں۔(4) جبکہ انسان اس وقت زمین پر آباد ہونے کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ مہر گڑھ، شاہی تمپ، کوئٹہ کے آثار، خاران اور خضدار کے آثار نال، مشکے اور بیلہ کی قدیم تباہ شدہ بستیاں اس حقیقت کو اور زیادہ مدلل بناتی ہیں کہ انسان نے ابتدائی بستیوں کا آغاز ہی بلوچستان کے خطے سے کیا تھا اور یہیں سے انسانی معاشرتی نظام اور تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی۔ بلوچستان کی قدیم

بستیاں جدید حجری دور سے تعلق رکھتی ہیں (5) جبکہ اس وقت کسی بڑی سلطنت کا وجود تک نہ تھا۔ مہر گڑھ کی بستی دنیا کی قدیم ترین بستی شمار کی جاتی ہے کہ جس کی قدامت لگ بھگ 11000 سال ہے۔ (6)

بلوچستان میں آرین قبائل کا دور 2000 ق م سے 1500 قبل مسیح میں ہوا (7) مگر شواہد یہ بتاتے ہیں کہ ان قبائل نے یہاں سکونت اختیار کرنے کی بجائے درہ بولان کے راستے سندھ وہند کی جانب اپنا سفر جاری رکھا (8) البتہ یہاں انہوں نے آگ وخون کا کھیل خوب کھیلا اور جو بھی آبادی ان کے سامنے آئی وہاں انہوں نے خوب تباہی وبربادی مچائی، آرین یلغار کے صدیوں بعد مشرق ومغرب میں عظیم سلطنتوں کا ظہور ہوا۔ تانبے کی دریافت وترقی نے بلوچستان کی دم توڑتی ہوئی قدیم تہذیب کو بالاخر مغلوب کیا اور بلوچستان بڑی طاقتوں کے مابین ایک فوجی وتجارتی گزرگاہ بن کر رہ گیا۔ مؤرخین کے مطابق بلوچستان (مکران) پر پہلا حملہ آشوری ملکہ سیمی رامس نے کیا جب اسے ہندوستان میں شکست ہوئی تو وہ مشرق وسطیٰ جانے کے لئے مکران پر حملہ آور ہوئی (9) مگر بڑی مشکل سے اپنی پوری فوج گنوا کر وہ صرف 20 سپاہیوں کے ساتھ عراق پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ (10) بعد ازاں جب ایران میں ہخامنشیوں کو اقتدار ملا تو انہوں نے بھی اس خطے کو اپنے زیر اثر رکھا۔ یونانی دور میں بلوچستان سکندر مقدونی کی ترکتازیوں کا شکار ہوا اور 326 ق م میں اس نے اپنی فوج کے ساتھ لسبیلہ اور مکران پر یلغار کی۔ (11) حتیٰ کہ بیرونی یلغاروں کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ گزرے ساڑھے تین ہزار سال کی تاریخ میں بلوچستان مسلسل بیرونی حملوں کا شکار ہوتا چلا آرہا ہے۔ وسطی دور یعنی 15 ویں صدی عیسوی میں بلوچ قبائل

نے کافی طاقت پکڑلی تھی اور انہیں آہستہ آہستہ خطے پر کنٹرول حاصل ہوتا جارہا تھا۔حتیٰ کہ سترھویں صدی کے اختتام اور اٹھارویں صدی کے آغاز سے وسط تک بلوچستان ایک مرکز کے تحت متحد ہو چکا تھا اور اٹھارویں صدی میں اس کی سرحدیں ایران میں بیرجند اور طبس سے شمال میں میناب کے ساحلوں تک اور شرقاً غرباً کرمان سے کوہِ سلیمان تک پھیل چکی تھیں انیسویں صدی میں برطانیہ کے ہندوستان میں مضبوط معاشی منڈی کے حصول کی جنگ اب اختتام پذیر ہونے والی تھی اور برطانیہ نے ہندوستان کے تقریباً تمام معاشی اداروں پر تسلط حاصل کرلیا تھا مگراس کی ہوس ملک گیری کی پیاس ختم نہیں ہوئی اوراس نے برطانیہ کی نوآبادیات کو روس سے بچانے کے بہانے ہندوستان سے افغانستان کی جانب جنگ کا دائرہ بڑھایا۔راستے میں آنے والی ریاستوں سندھ،بہاولپور ،بلوچستان وغیرہ پر جابرانہ طریقے سے جنگ مسلط کر کے انہیں کچل دیا اور ان خطوں پر قبضہ کرکے انہیں افغانستان کی جنگ میں جنگی اڈے،فوجی گزرگاہ اورنوآبادیات کے طور پر استعمال کیا۔گریٹ گیم کے دوران بلوچستان کی جغرافیائی وعلاقائی اہمیت زیادہ شدت اختیار کرچکی تھی اورہر بڑی طاقت کی خواہش تھی کہ انہیں بلوچستان کے گرم ساحلوں اورتنگ دروں پر رسائی حاصل ہو، بین الاقوامی سطح پر ہونے والی سازشوں اور بلوچ سرزمین اور وسائل کا بے دردی کے ساتھ غیر اخلاقی استعمال نے بلوچ قوم پرستانہ جدوجہد کوجنم دیا اورنوجوانوں کومتحد ہونے کا موقع فراہم کیا۔آج جدید دور میں لاتعداد معدنیات کی دریافت،ایندھن کے بے شمار وسائل کی موجودگی اہم جغرافیائی محل وقوع،امریکہ کے افغانستان پر حملے اور بلوچستان کی جغرافیائی اہمیت،مشرق وسطیٰ اورایران کی ہمسائیگی،طویل ساحل سمندر حتیٰ کہ کئی وجوہات ہیں

کہ جن کی وجہ سے بلوچستان زیادہ اہمیت کا حامل بن چکا ہے اور جتنی شدت کے ساتھ بلوچستان کے خلاف عالمی سازشیں ہورہی ہیں ان کی وجہ سے یہ خطہ مستقبل میں متوقع کسی بڑی عالمی جنگ کا میدان بن جائیگا۔

برطانوی دور میں بھی بلوچستان بیرونی سازشوں کے تسلط کا شکار رہا جس کی وجہ سے یہاں پر غیر منظم انداز میں ردعمل سامنے آیا آئندہ اوراق میں بلوچستان میں برطانوی جاسوسوں کی آمد سے قبل بلوچستان کے سیاسی حالات کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

حوالہ جات:

1۔ عنایت اللہ بلوچ۔دی پرابلم آف گریٹر بلوچستان،اے کیس سٹڈی آف بلوچ نیشنل ازم،سٹٹ گرٹ، جی ایم بی ایچ، جرمنی، 19,1987

2۔ ملک صالح محمد خان لہڑی، تاریخ بلوچستان ون یونٹ تک، ہفتہ وار باغ و بہار، کوئٹہ،1952، 3,4

3۔ عنایت اللہ بلوچ، 21

4۔ فاروق بلوچ،مہر گڑھ، ایشیاء کی تہذیب میں اس کی اہمیت، بلوچستان سٹڈی سینٹر، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، 5,6,2011

5۔ محمد سعید دہوار، تاریخ بلوچستان،نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 750,1990

6۔ فاروق بلوچ، 6

7۔ ای مارسڈن، تاریخ ہند، بک ہوم، لاہور، 20, 23,2006

8۔ محمد سعید دہوار۔ 147,48

9۔ ونسنٹ اے سمتھ، قدیم تاریخ ہند، ترجمہ: مولانا محمد جمیل الرحمٰن،تخلیقات، لاہور، 125,2001

10۔ محمد سعید دہوار، 170

11۔ ونسنٹ۔اے سمتھ، 125,142

باب دوئم:

برطانوی جاسوسوں کی آمد سے قبل بلوچستان کے سیاسی حالات

بلوچستان میں برطانوی جاسوسوں کی آمد کا سلسلہ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا۔ برطانوی مداخلت سے قبل بلوچستان ایک منظم ملک تھا جس میں بلوچ قوم کی حکومت قائم تھی ۔ 1410ء سے جس حکومت کا آغاز بلوچوں کے کمبرانی میروانی قبائل نے کیا تھا وہ اب پھیل کر ایک مضبوط، مستحکم اور وسیع سلطنت کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ گو کہ آغاز میں ان قبائل کا دائرہ کار زیادہ وسیع نہ تھا اور وہ سوراب، نغاڑ، چپر، زیارت اور قلات تک محدود تھے اور بلوچستان پر مغلوں کی حکومت قائم تھی مگر سارے بلوچستان پر انہیں تسلط حاصل نہ تھا بلکہ وہ پایہ تخت قلات، مستونگ، کوئٹہ اور سبی وغیرہ پر تسلط رکھتے تھے یہ قبضہ صرف فوجی نوعیت کا تھا اور وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے میں ناکام رہے تھے لہٰذا ایک عام بلوچ منگولوی تسلط کو اپنی غلامی سے تعبیر کرتا تھا اور ان کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل پیرا ہونے کی بجائے اپنی قومی اور قبائلی اقدار کو ترجیح دیتا تھا۔ لہٰذا منگول کبھی بھی ان قبائل کی تسخیر نہ کر سکے ۔ 1410ء میں میروانی بلوچوں نے قلات کے دہواروں اور آس پاس کے دیگر قبائل سے مل کر منگول اقتدار کا خاتمہ کیا اور پایہ تخت پر قبضہ کرلیا اور بلوچ حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ جس وقت کمبرانی میروانی قبائل کو قلات اور سوراب میں اقتدار حاصل ہوا تو اس زمانے میں بلوچستان کا شیرازہ مکمل طور پر بکھرا ہوا

تھا اور یہ مختلف علاقوں میں منقسم ہو کر مختلف قبائل کے زیر اثر تھا۔مکران پر ملکوں کے بعد بلیدی قبائل نے قبضہ کیا اور مکران کو ایک ایسی ریاست کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی کہ جو مقامی قبائل کے زیر اثر اور وسط ایشیائی یا ایرانی حکمرانوں کے ماتحت تھا۔ سیستان پر قبائل بلوچ کا تسلط ہونے کے باوجود وسط ایشیائی اور ایرانی خاندانوں نے ہمیشہ اسے اپنے زیر قبضہ رکھا حتیٰ کہ باقی ماندہ بلوچستان بھی ہمیشہ بیرونی اقتدار کے ماتحت رہا اور بیرونی حکمران ہمیشہ اس کے حصے بخرے کرتے رہے تا آنکہ کمبرانی بلوچوں نے قلات پر قبضہ کر کے بلوچی اقتدار کا آغاز کیا۔ 1410ء سے 1666ء تک میروانی قبائل انتہائی نامساعد حالات اور وسائل نہ ہونے کے باوجود اپنی محنت اور خون سے اپنے خطے کی نہ صرف حفاظت کرتے رہے بلکہ اس کے مختلف حصوں کے اتحاد کے لئے بھی کوشاں رہے۔ 1666ء میں کمبرانی قبائل کی ایک اور ذیلی شاخ نے اقتدار سنبھالا اور میر احمد خان اوّل نے قلات پر اپنی حکمرانی شروع کی۔(1) اس دلیر و دبنگ حکمران نے بلوچستان کے بیشتر ٹوٹے ہوئے انگوں کو اکٹھا کر کے منظم کیا اور طمطراق کے ساتھ 29 سال حکمرانی کرنے کے بعد 1695ء میں رحلت فرمائی (2) اس کے بعد تخت قلات کو جو بھی حکمران ملے وہ میر احمد خان جیسے عظیم حکمران (خان) کی مناسبت سے احمدزئی کہلائے۔احمد زئی خاندان کے کئی قابل حکمرانوں نے بلوچستان کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یکجا کرنے اور بلوچ قبائل کو ایک قومی دائرے میں لانے کے لئے گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ خصوصاً میر احمد خان اول (1666-1695) میر عبداللہ خان قہار (1716–1731) اور میر نصیر خان نوری (1749-1794) بلوچستان کے قدیم جغرافیہ کی بحالی، اتحاد اور

بلوچ قومی یکجہتی کے لئے نا قابل فراموش کردار ادا کرتے رہے ۔ میر نصیر خان نوری کے عہد میں پہلی بار بلوچستان کی جغرافیائی حیثیت واضح ہوئی اور بلوچستان کے خارجی تعلقات بیرونی دنیا کے ساتھ قائم ہوگئے اور بلوچستان کا رقبہ 3,40,000 مربع میل تک پھیل گیا۔ میر نصیر خان نوری کے زمانے کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ برطانوی جاسوسی مہمات سے فوراً پہلے کا دور ہے میر نصیر خان نے قلات (بلوچستان) پر اٹھارہویں صدی کے وسط سے آخری عشرے کے وسط تک یعنی 1749 ء سے لے کر 1794 ء تک حکمرانی کی اور اس دوران نہ صرف بلوچستان کے بکھرے اور علیحدہ ہوئے حصوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہوا اور انہیں ایک ہی جغرافیائی لڑی میں پرودیا بلکہ منتشر اور قبائلی عصبیتوں کا شکار بلوچ قوم کو بھی متحد و منظم کرنے میں کامیاب ہوا۔

انگریزی مداخلت سے قبل بلوچستان میں ایک وسیع قومی حکومت قائم تھی کہ جس کا مرکز قلات تھا۔ یہ حکومت کئی نشیب وفراز سے گزر کر اٹھارہویں صدی میں بام عروج پر جا پہنچی۔ اٹھارہویں صدی میں قلات کو دو ایسے حکمران نصیب ہوئے کہ جنہوں نے گمنامی اور پستی میں پڑی ہوئی بلوچ قوم کو سیاسی عروج اور شہرت عطا کی۔ ان میں اول شخصیت میر عبداللہ خان قہار کی تھی کہ جنہوں نے مرکز قلات سے چاروں سمتوں میں دور دور تک کامیاب یلغاریں کر کے قندھار کی سرحدوں سے لے کر ساحل مکران تک اور بندر عباس سے ڈیرہ غازی خان تک وسیع علاقے کو 15 سالوں تک جولان گاہ بنائے رکھا، اوران تمام حدود میں اپنے گھوڑے دوڑائے کہ جہاں بلوچ قبائل آباد تھے مگر مرکز قلات بلکہ بلوچ قومی دھارے سے کٹے ہوئے تھے میر عبداللہ خان ایک عظیم سپاہی تھے مگر ان کا

جانشین میر محبت خان ان کی طرح قابل اور بہادر ثابت نہ ہوا۔ ایران میں نادر شاہ افشار نے ظہور پذیر ہو کر تمام ایران، افغانستان، سندھ، ہند اور وسط ایشیاء کی ریاستوں پر قبضہ کرلیا تو بلوچستان کے خان میر محبت خان بھی ان کے اتحادیوں میں شامل ہوئے اور نادری کیمپ کا ایک اہم حصہ بن گئے مگر اس کے اس فیصلے نے مستقبل میں بلوچستان کے لئے بہت مسائل پیدا کئے۔

میر محبت خان اور میر اہلتاز خان یکے بعد دیگرے حکمران بنے مگر دونوں نااہل ثابت ہوئے اور بلوچستان بدستور نادر شاہ افشار کے زیر اثر رہا 1747ء میں نادر شاہ افشار اپنے بھتیجے کے ہاتھوں ایران میں قتل ہوا(3) تو احمد خان سدوزئی المعروف احمد شاہ ابدالی نے اپنی افغان سپاہ اور قبائلی سرداروں کے تعاون سے قندھار میں افغان حکومت کی داغ بیل ڈالی۔(4)

1749ء میں نصیر خان قلات میں برسر اقتدار آیا تو اس پر جلد ہی یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ وہ بلوچستان کا آزاد اور خود مختار حاکم نہیں ہے بلکہ افغانستان کی نوزائیدہ مملکت قلات کو اپنا حصہ تصور کرتی ہے اور احمد شاہ ابدالی اپنے آپ کو نادر شاہ افشار کا وارث قرار دے کر قلات کو اپنی میراث سمجھتا ہے(5) پچھلے 18 سالوں کی حکومت کے دوران میر محبت خان اور میر اہلتاز خان نے تمام ملکی ادارے تباہ کر دیئے تھے۔ خارجہ پالیسی، داخلہ پالیسی، مالیات، عدلیہ، مقننہ حتیٰ کہ کوئی ریاستی ستون ایسا نہیں تھا کہ جو شکستہ و ریختہ نہ ہو۔ قومی آزادی سلب ہو چکی تھی۔ قبائل آپس میں برسر پیکار تھے اور ان میں تنظیم نامی کوئی شے نہیں تھی۔ وہ قبائلی لشکر کہ جس کی مدد سے میر محبت خان کے والد میر عبداللہ خان قہار نے مغرب میں بندر عباس سے لے کر مشرق میں ڈیرہ جات ہڑند وداجل تک اور شمال میں قندھار

سے لے کر جنوب میں ساحل مکران تک اپنے سطوت وجبروت کے پرچم گاڑھے تھے اب تتر بتر ہو چکا تھا اور میر محبت خان و میر اہلتاز خان کے ناروا رویوں کی وجہ سے قبائلی سردار حکومتی معاملات سے کنارہ کش ہو چکے تھے اور چند ایک سرداروں کے علاوہ اکثریتی سردار انہیں قبائلی لشکر دینے سے کتراتے تھے۔ ملکی نظام حکومت درہم برہم ہو چکا تھا میر محبت خان کی ناروا داری اور متشددانہ پالیسیوں کی وجہ سے تمام قبائلی سردار اس سے متنفر ہو کر میر نصیر خان کو خان بنانے کی کوششوں میں سرگرم ہو گئے۔ میر نصیر خان کو بھی ورثے میں جو حکومت ملی اور جس ملک کا وہ خان (حکمران) بنا اس میں نہ تو ادارے تھے اور نہ ہی ملکی جغرافیہ معلوم تھا۔ اوپر سے احمد شاہ ابدالی کے بلوچستان پر ملکیت کے دعوے نے حکومت قلات اور ان کی آزادانہ اقتدار کو مشکوک بنا دیا۔ 1758ء میں میر نصیر خان اور احمد شاہ ابدالی کے مابین کئی خونریز جھڑپوں کے بعد ایک معاہدہ طے پایا جسے معاہدہ قلات یا معاہدہ عدم مداخلت 1758ء کہا جاتا ہے۔(6) اس معاہدے کے بعد نہ صرف یہ کہ بلوچستان کی آزادانہ حیثیت کو افغانستان نے تسلیم کیا اور آئندہ بلوچستان کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا اقرار کیا بلکہ اس معاہدے نے بلوچستان کے حقیقی جغرافیہ کو بھی واضح کیا اور ساتھ ہی اس معاہدے کی وجہ سے میر نصیر خان کی اندرونی و بیرونی مہمات کے لئے بھی راستہ کھل گیا۔ انہوں نے اپنی آزادانہ خارجہ پالیسی کو تکمیل دیتے ہوئے کئی ممالک میں اپنے سفیر روانہ کئے اور کئی ممالک کے سفیر قلات چلے آئے۔ بیرونی دنیا کے ساتھ تجارت شروع ہوئی اور بلوچستان کی مختلف شاہراہیں تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے مصروف نظر آنے لگیں، قلات شہر میں کئی اقسام کے کارخانے لگ گئے اور یہاں کی آبادی نوے ہزار سے تجاوز کر گئی۔ زرعی نظام میں زبردست انقلاب آیا۔ نئے ڈیم تعمیر ہوئے جبکہ

پہاڑی وادیوں میں جہاں پانی کی کمی تھی پرانی کاریزات کی صفائی کے ساتھ ساتھ نئی کاریزات کھدوا کر زراعت کو مزید ترقی دی گئی اور ملکی مالیہ میں اضافہ کیا گیا۔

سیاسی اداروں کو ترقی دی گئی۔دربار قلات کو نئے سرے سے ایرانی طرز پر بنا کر اس میں سرداروں اور عوام کے لئے نشستیں مخصوص کی گئیں۔ سراوان وجھالاوان کے سرداروں کی حیثیت بڑھا دی گئی اور انہیں خان نے اپنے دائیں اور بائیں پہلو میں جگہ دی جبکہ دیگر سرداروں اور مصاحبین کی بھی ان کے مرتبہ کے مطابق نشستیں مخصوص تھیں۔ تمام اداروں کو منظم کر کے مالیات، عدلیہ، انتظامیہ اور فوج کو مضبوط بنایا۔ مالیات کے شعبہ کا سربراہ وکیل کہلاتا تھا جبکہ عدلیہ کا سربراہ قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس ہوتا تھا۔علاوہ ازیں پولیس یا انتظامیہ کا سربراہ داروغہ کہلاتا تھا۔ وزیر اعظم کو آخوند جبکہ وزیر دربار کو شاغاسی کہا جاتا تھا۔(7) ان تمام عہدیداروں کو ان کے محکموں کے تمام تر اختیارات کلی طور پر سونپ دیئے گئے اور یہ عہدیدار صرف خان کے سامنے جوابدہ تھے۔ ملک میں قانون کی بالادستی قائم کرنے اور لوگوں کو قانون کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے ایک آئین مرتب کیا گیا۔(8) جس میں عوام وخواص کے حقوق برابر رکھے گئے تھے اور سب کے لئے آئین کی پاسداری لازمی قرار دی گئی تھی۔ انتظامی طور پر ملک کو مختلف نیابتوں (صوبوں) میں تقسیم کیا گیا اور ہر نیابت پر ایک نائب مقرر کیا گیا۔نائب کا تقرر خان، مجلس مصاحبین (مجلس مشاورت) میں کرتا تھا کہ جس کے پانچ ارکان تھے جو ضروری جانچ پڑتال کے بعد نائبوں یا مرکزی عہدیداروں کے تقرر کا فیصلہ کرتے۔ بلوچ قبائل سے ایک مضبوط اور لڑاکا فوج تیار کی جسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا یعنی دستہ سراوان جسے سراوان کے

چیف (رئیسانی) قبیلہ اور دستہ جھلاوان کو چیف آف جھلاوان (زرکزئی) قبیلہ کے زیر کمان رکھا۔اس کے علاوہ ہر اول دستہ جو دستہ خاص اور دستہ خان بھی کہلاتا تھا کو خان نے براہ راست اپنی زیر کمان رکھا۔بوقت ضرورت وہ مختصر مدت میں دولاکھ جوان اکٹھا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔جیسا کہ انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ایک رجسٹر میں دولاکھ جوانوں کے نام لکھ کر اس پیغام کے ساتھ بھیجے تھے کہ دولاکھ تلواریں قلات میں آپ کا انتظار کررہی ہیں (9) جب کہ مختلف بیرونی مہمات میں انہوں نے احمد شاہ ابدالی کی 10 ہزار سے لے کر پچیس ہزار فوج کے ساتھ مدد بھی کی اور افغان فتوحات میں ہمیشہ مرکزی کردار ادا کیا۔ فوج کے حصول کا ذریعہ قبائل ہوتے تھے خصوصاً سراوان وجھلاوان کے قبائل قلات کے لئے دو مضبوط بازوؤں کی حیثیت رکھتے تھے جہاں سے زیادہ تر فوج حاصل ہوتی تھی جب کہ دیگر علاقوں کے جوان بھی قلات کو اپنی فوجی خدمات پیش کرتے تھے۔فوج کے تمام تر اخراجات اور تنخواہ جات قومی خزانہ پورا کرتا تھا جب کہ بیرونی مہمات میں احمد شاہ ابدالی کی جب مدد کی جاتی تو فوجی اخراجات ، سازوسامان، اسلحہ جنگ، راشن وغیرہ کے علاوہ ایک لاکھ روپے سالانہ کے حساب سے افغان حکومت، خان بلوچ کو ادا کرتی تھی جو کہ عہدنامہ قلات یا معاہدہ عدم مداخلت 1758 میں طے پایا تھا(10)اسی طرح قائم کئے گئے صوبوں کی نوعیت بھی مختلف تھی۔بیلہ، خاران اور مکران نیم آزاد ریاستیں تھیں۔

جہاں کا نصف مالیہ قلات کو ملتا تھا اور فوجی امداد کی صورت میں مکمل مالیہ معاف تھا جبکہ خان کا نائب ریاستی نواب کے ساتھ مل کر حکومتی معاملات چلاتا تھا جبکہ آئین وقانون اور احکامات مرکز قلات کے ہوتے تھے۔ایرانی

بلوچستان اور سیستان کے صوبوں پر فوجی امداد اور مالیہ حسب توفیق اور رضا کارانہ طور پر لاگو تھا یہ ان پر منحصر تھا کہ وہ مرکز کو کچھ ادا کرتے ہیں یا نہیں البتہ وہ قلات کی بالادستی اور آئین وقانون کی مکمل پاسداری کرتے تھے۔ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان مالیہ دینے والے صوبے تھےجن سے سالانہ بالترتیب 6,70,000اور 120,000 روپئے مالیہ وصول کیا جاتا تھا اور خان کا نائب وہاں بیٹھ کر ملکی معاملات چلاتا تھا،سراوان وجھلاوان فوجی قوت تھے اور ریاست کی بنیادوں کو انہوں نے ہمیشہ اپنے خون سے استحکامت دی تھی لہٰذا ان سے کوئی مالیہ نہیں لیا جاتا تھا بلکہ ان قبائل اور ان کے سرداروں کو بڑی مراعات حاصل تھیں اور انہیں خصوصاً سراوان کے قبائل کو کچھی کے زرخیز صوبے میں بڑی بڑی زرعی اراضیات ملی تھیں جو ان کی خدمات کا صلہ تھیں۔ کچھی سب سے زرخیز صوبہ تھا کہ جو دراصل قلات کی حکومت کے استحکام میں مرکزی کردار ادا کرتا تھا،کچھی خان کا سرمائی دارالحکومت بھی تھا۔سردیوں میں خوانین قلات کچھی منتقل ہوتے تھے اور ڈھاڈر اور گنداواہ میں قیام کرتے تھے اور قلات کی تمام رونقیں کچھی منتقل ہوتی تھیں۔مالیہ وصولی کے بھی کئی ذرائع تھے یعنی تجارت،سنگ،مالیہ،ماہی گیری،زراعت،قالین بافی،اسلحہ سازی،درآمدات و برآمدات،جزیہ،خراج، مال غنیمت وغیرہ۔ سندھ سے 40ہزار روپے سالانہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔(11)

اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف کے دوران بلوچستان میں حقیقتاً ایک مثالی حکومت قائم تھی حکمران اور اس کے نائبین کے زیر سایہ بلوچ عوام آرام وآسائش کی زندگی گزار رہے تھے میر نصیر خان ایک ذہین اور فطین انسان تھے انہوں نے اپنی زندگی کے وہ ماہ وسال دربار نادری میں ایک یرغمالی شہزادے

کے طور پر گزارے تھے کہ جس میں ایک انسان سن بلوغت میں داخل ہو رہا ہوتا ہے۔اس عمر میں انسان میں سیکھنے اور ذہن نشین کرنے کا عمل تیز ہوتا ہے اور نصیر خان کو اللہ نے ویسے ہی ذہانت دی تھی۔ انہوں نے دربار نادری میں رہتے ہوئے ہیبت نادری اور طرز حکومت نادری کا بغور مشاہدہ ومطالعہ کیا تھا اور کئی مہمات میں اس کے ہمرکاب رہا تھا لہٰذا جب انہیں قلات پر حکومت کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے اپنے انہی تجربات کو استعمال کیا اور نہ صرف اپنے ملک کا جغرافیہ واضح کیا بلکہ اس پورے خطے میں کہ جس کی آبادی مورخین ایک سے دو کروڑ کے مابین بیان کرتے ہیں۔(12) ایک ہی آئین وقانون کی حکومت قائم کی اور تمام لوگوں کو ان کی استطاعت کے مطابق مرتبہ عطا کیا اور ان کو محفوظ ومامون بنایا۔ ان کے 45 سالہ دورِ حکومت میں بلوچستان میں امن وامان رہا اور بلوچ حکومت کو عروج حاصل ہوا۔سیاسی، معاشی، معاشرتی، عسکری حتیٰ کہ ہر لحاظ سے یہ ایک مثالی خطہ تھا کہ جس کے اختیار میں اتنے وسائل تھے کہ جو اس پورے علاقے کے لوگوں کی خوشحالی اور استحکام کا ضامن بن سکتے تھے اور نصیر خان جیسا ایک ذہین سیاستدان ان وسائل سے بھر پور فائدہ اُٹھا کر انہیں ملکی استحکام اور عوامی خوشحالی وآسودگی پر خرچ کر رہا تھا۔اٹھارہویں صدی کے دوران بلوچستان ایک مضبوط اور مستحکم مملکت میں تبدیل ہو چکا تھا اور اس وسیع وعریض خطے میں ہر طرف امن، آشتی اور سکون تھا۔عوام الناس جو کہ بلوچ قبائل پر مشتمل تھے اور خواص جو کہ قبائلی سردار اور حکومتی عمائدین تھے سبھی مملکت کی خوشحالی اور امن واستحکام میں خوش تھے اور اسے مزید مضبوط بنانے کے لئے کوشاں تھے ہمسایہ ممالک خصوصاً افغانستان کے ساتھ انتہائی دوستانہ تعلقات کے استوار

ہونے کے بعد بلوچستان روز افزوں ترقی وحدت کی طرف گامزن تھا۔ حتیٰ کہ یہ سلسلہ 1794ء تک اسی طرح چلتا رہا تا آنکہ میر نصیر خان نوری کا انتقال ہوا۔ ان کی وفات کے بعد بلوچ قبائلی سرداروں اور عمائدین نے متفقہ طور پر ان کے بڑے بیٹے میر محمود خان اول کو قلات کے تخت پر متمکن کیا جبکہ اس وقت ان کی عمر 10 سال اور بعض مورخین کے مطابق 7 سال تھی۔ (13) لہٰذا ان کی کمسنی اور ناتجربہ کاری کو مدنظر رکھتے ہوئے آخوند فتح محمد کو ان کا اتالیق مقرر کیا گیا (14) کمسن محمود خان کی ناتجربہ کاری اور آخوند فتح محمد کے اتالیق مقرر ہونے کے بعد بلوچ حکومت آہستہ آہستہ روبہ زوال ہونے لگی۔ 1795ء میں تالپوروں نے کراچی کی بندرگاہ پر قبضہ کر کے اسے سندھ میں شامل کیا (15) بعد ازاں میر محمود خان نے اپنے چھوٹے بھائیوں میر رحیم خان اور میر مصطفیٰ خان کو بھی مختلف اوقات میں قتل کروا کے بلوچستان میں عدم استحکام پیدا کرنے کا سبب پیدا کیا۔ (16)

1795ء میں انگریزی جاسوسوں کا ورود ہوا اور برطانوی حکومت ہند نے جو کہ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کہلاتی تھی۔ غلام سرور نامی ایک شخص کو اندرون بلوچستان وسیستان جاسوسی کی غرض سے روانہ کیا (17) میر نصیر خان کی رحلت کے بعد حالات نے یکسر پلٹا کھایا اور غیر ملکی اکابرین کا دربار قلات میں اثر ورسوخ بڑھتا گیا۔ قبائلی سرداروں نے اپنی من مانیاں شروع کیں اور سرکاری اراضیات اور انعامی زمینوں پر قبضہ کرنے لگے آئین وقانون کا نام آہستہ آہستہ مٹتا جارہا تھا اور حالات روز بروز خراب ہوتے جارہے تھے۔

دوسری طرف ہندوستان میں جب 1761ء میں مرہٹوں کو شکست ہوئی اور پانی پت کے میدان میں افغان وبلوچ لشکر نے لاشوں کے انبار لگادیئے (18) تو

مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا مگر افغان بھی دہلی میں قدم نہ جما سکے اور مغل حکمران کو مزید دولت سے محروم کر کے اکیلا اور تن تنہا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے انگریزوں کو ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کا موقع مل گیا۔ 1757ء میں انگریزوں نے بنگال کے حکمران نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کرلیا۔(19)اور ساتھ ہی سلطان فتح علی ٹیپو کو بھی شکست ہوئی جس کی وجہ سے جنوبی ہندوستان پر انگریزوں نے قبضہ کر کے فرانسیسی اثر ورسوخ کا مکمل طور پر صفایا کر دیا۔(20)ہندوستان میں اٹھارہویں صدی کے اختتام تک انگریز ایک بہترین پوزیشن پر آچکے تھے اور مغل حکمران محض بے بسی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں قدم جمانے اور یہاں کی وسیع معاشی منڈی پر اختیار حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے اپنی پیش قدمی مزید شمال اور مغرب کی جانب جاری رکھی اور نام نہاد روسی خطرے کا بہانہ کر کے کئی آزاد اور خود مختار ریاستوں مثلاً سندھ، بہاولپور، بلوچستان اور افغانستان پر اپنا قبضہ جمایا۔

اٹھارہویں صدی کے اختتام پر برطانوی حکام نے محسوس کیا کہ شمال اور شمال مغرب کی جانب ان کی برطانوی مقبوضات کو روسی جارحیت سے خطرہ درپیش ہے اور انہیں اس بات کا بھی ڈر تھا کہ افغانستان اور ایران سے روسی اور فرانسیسی افواج ہندوستان میں مداخلت کر سکتی ہیں جس کی وجہ سے انہیں بدترین صورتحال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ یہ صرف ایک بہانہ تھا وگرنہ برطانیہ کی پالیسی مزید زمینوں پر قبضہ کرنا تھا۔ یہ ہر طاقت ور کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ نام ونمود کی خاطر زیادہ سے زیادہ فوجی کارنامے سرانجام دے اور بڑے سے بڑا حاکم کہلائے۔ اپنی ہوس کی آگ بجھانے کی خاطر یہ طاقتور ممالک چھوٹے اور نسبتاً کمزور ممالک پر قبضہ جماتے جاتے ہیں اور اپنی سرحدات کی توسیع میں اضافہ کر کے اپنی ہوس

ملک گیری کی خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اپنی ان خواہشات کی تکمیل کی خاطر انہیں صرف بہانے تراشنے کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ سکندر نے نام ونمود کی خاطر مختلف بہانوں سے دنیا کے پر امن خطوں پر قبضہ جمایا، جیسا کہ روس نے افغانستان میں انقلاب کے تحفظ کے بہانے فوجی مداخلت کی اور موجودہ دور میں امریکہ کے توسیع پسندانہ عزائم نمایاں ہیں کہ کس طرح وہ عراق پر جوہری ہتھیاروں کے بنانے کاالزام عائد کرکے اور افغانستان میں اسامہ بن لادن کی موجودگی کا بہانہ بنا کر کے ان مما لک پر حملہ آور ہوا۔لہٰذا طاقتور کو بہانے تراشنے سے کوئی نہیں روک سکتا اسے صرف اپنے خواہشات کی تکمیل چاہیے ہوتی ہے اور برطانیہ کی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ اپنی سرحدات کوزیادہ سے زیادہ توسیع دے۔

انگریزوں کی مداخلت سے قبل بلوچستان کا خطہ ایک مثالی خطہ تھا اور یہاں پر وسط ایشیائی طرز کی خانیت قائم تھی مگروسط ایشیا کے وحشی قبائل کی طرح یہاں بدامنی نہیں پائی جاتی تھی اور پورا خطہ سیاسی ومعاشرتی طور پر پُرامن اور معاشی طور پر مستحکم تھا۔ یہ ایک عظیم گزرگاہ تھی کہ جہاں سے بڑے بڑے قافلے مشرق سے مغرب اورشمال سے جنوب کی جانب رواں دواں رہتے تھے ایک طویل ساحل کی وجہ سے بحری تجارت اپنے عروج پر تھی اور کئی مما لک کے تاجران ساحلی بندرگاہوں پر تجارتی مال کی خرید وفروخت کرتے نظر آتے تھے جبکہ یہ وہ زمانہ تھا جب آس پاس کے خطوں ایران ، افغانستان ، سندھ ، پنجاب حتیٰ کہ ہندوستان بھر میں شدید سیاسی ، معاشرتی اور معاشی بحران تھا اور یہ تمام خطے انارکیت کا شکار تھے، مورخین بھی اٹھارہویں صدی کے بلوچستان اور خصوصاً میر نصیر خان نوری کے عہد 1749 تا 1794ء کووسط ایشیائی طرز کی مثالی حکومت قرار دیتے ہیں (21) نہ صرف

ملکی مورخین بلکہ خود برطانوی مورخین اور دیگر کئی اقوام سے تعلق رکھنے والے مصنفین میر نصیر خان کے عہد کو اس زمانے کا بہترین اور حکومت کو مثالی تحریر کرتے ہیں۔ (22) مگر جوں ہی برطانوی جاسوسوں نے یہاں مداخلت کر کے برطانوی افواج کے لئے راستہ ہموار کرنا شروع کیا تب سے یہاں عدم استحکام کا سلسلہ شروع ہوا جو بالآخر قلات کی حکمرانی کے خاتمے اور بلوچستان پر قبضہ کرنے پر منتج ہوا۔

میر محمود خان اول کا دور گو کہ عدم استحکام کا تھا مگر بلوچستان میں عوامی سطح پر اب بھی لوگ دورنصیری کو یاد کرتے تھے کہ جس کا مطلب تھا کہ ان میں اجتماعی شعور کی کمی نہ تھی اور وہ دوبارہ استحکام اور خوشحالی کی جانب گامزن ہونا چاہتے تھے مگر درباری وزراء، وکلا، مشیر اور دیگر اعلیٰ ترین عہدے غیر ملکی افراد کے پاس تھے کہ جن کے دل میں بلوچستان کے لئے محبت اور دلچسپی کے کوئی جذبات نہیں تھے وہ صرف اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے خواہاں تھے حتیٰ کہ ان میں سے بعض میر محراب خان کے دور میں حکمرانی کی گدی کے لئے بھی سرگرم رہے۔ جو ملکی سردار اور قبائلی رہنما تھے یا تو انہیں نظر انداز کیا گیا یا پھر انہوں نے اپنے مفادات کو ترجیح دی اور اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے ملکی نقصان کا سبب بنتے گئے وہ سرکاری اراضیات پر قابض ہو کر ریاست کے استحکام کو نقصان پہنچاتے اور غداران قوم و وطن کے ارادوں اور کوششوں کو استقامت بہم پہنچا رہے تھے اور نہ صرف یہ کہ انہیں قلات پر بیرونی اقتدار قائم کرنے میں مددگار ثابت ہو رہے تھے بلکہ اپنے لئے اور اپنے قبائل کے لئے دائمی غلامی کا سامان بھی پیدا کر رہے تھے۔

بلوچستان کے سیاسی حالات کا صحیح تجزیہ کرنے کا ذریعہ یہی برطانوی جاسوسوں، ایجنٹوں، سول اور فوجی افسران کی تحریریں ہیں کہ جن سے مورخین اور قارئین نہ صرف استفادہ کرتے ہیں بلکہ ان پر تجزیہ بھی کرتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ انگریز جاسوسوں کی آمد سے قبل کے بلوچستان کے حالات کو صرف ان ہی تحریروں کی روشنی میں دیکھا جائے کہ جو انگریزوں کی اپنی تحریر کردہ ہیں بلکہ بعض دیگر ذرائع بھی ان حالات کا تجزیہ کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں البتہ انگریزی جاسوسوں کی تحریروں سے ان کی اپنی خواہشات اور حکمت عملیوں Policies کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔

بلوچستان کے پرامن اور آسودہ وخوشحال ماحول کو پراگندہ کرنے کا آغاز 1795ء سے ہوا مگر باقاعدہ برطانوی فوجی جاسوسوں کا ورود اس خطہ میں 1810ء میں شروع ہوا اور پہلا انگریزی جاسوس ہنری پوٹینگر اپنے ساتھی جاسوس کیپٹن کرسٹی کے ساتھ ساحلی علاقوں سے بلوچستان میں داخل ہوا اور بلوچستان اور بلوچ عوام کے لئے ایک لمبی غلامی کا سندیسہ بھی ساتھ لے کر آیا۔

حوالہ جات:

1۔ میر احمد یار خان، تاریخ خوانین بلوچ، اسلامیہ پریس، کوئٹہ، 1974، 24

2۔ ایضاً، 30

3۔ لارنس لاک ہارٹ، نادر شاہ، مترجم، طاہر منصور فاروقی، تخلیقات، لاہور، 2007، 367

4۔ جی۔ پی۔ ٹیٹ، کنگڈم آف افغانستان، انڈس پبلیکیشنز، کراچی، 1973، 68

5۔ ایضاً، 75,

6۔ گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1990، 214

7۔ میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، قلات پبلشرز، کوئٹہ، 2000، 88-95

8۔ میر احمد یار خان، 63-65

9۔ گنڈا سنگھ، 210

10۔ عنایت اللہ بلوچ، دی پرابلم آف گریٹر بلوچستان، جی ایم بی ایچ، سٹٹ گرٹ، جرمنی، 1987، 21

11۔ ایضاً، 119

12۔ پروفیسر، ایم انور رومان، کوئٹہ قلات کے براہوئی، مترجم، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، قریشی پبلیکیشنز، کوئٹہ، 1987، 104

13۔ میر گل خان نصیر، 94

14۔ ایضاً، 94-95

15۔ احمد حسین صدیقی، گوہر بحیرہ عرب (کراچی)، محمد حسین اکیڈمی، فیڈرل بی ایریا کراچی، 1995، 68

16۔ میر گل خان نصیر، 94

17۔ عنایت اللہ بلوچ، 119

18۔ جی۔ پی۔ ٹیٹ، 83

19۔ کارل مارکس، ہندوستان کا تاریخی خاکہ، تخلیقات، لاہور، 2002، 94

20۔ ایضاً، 45-144

21۔ میر احمد یار خان، 56-55

22۔ ایڈورڈ۔ ای آلیور، پٹھان اور بلوچ، مترجم، ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1984، 42-41

باب سوئم:

برطانوی جاسوسوں کی آمد اور ان کے مقاصد

بلوچستان برطانوی مداخلت سے قبل ایک وسیع وعریض خطے زمین پر مشتمل تھا۔اس کا کل رقبہ ماہرین ومورخین کے مطابق 3,40,000 مربع میل تھا(1)اس خطہ زمین میں تقریباً100 فیصد بلوچ قبائل قلات کی مرکزیت میں آرام وسکون کی زندگی گزار رہے تھے۔اٹھارہویں صدی کے اختتام تک تقریباً تمام بلوچ علاقہ قلات کی مرکزیت میں متحد ہوچکا تھا۔بلوچ قبائل قدیم طرز قبائلیت سے جدید قوم پرستانہ اتحاد کی طرف گامزن تھے اور دور ونزدیک یہ حکومت 'حکومت بلوچی' کے نام سے شہرت پا چکی تھی اور قلات کے حکمران قبائلی حکمران کی بجائے قومی حکمران یعنی خان بلوچ کہلاتے تھے۔

جس زمانے میں بلوچستان امن واستحکام کی جانب گامزن تھا آس پاس کے دیگر خطوں افغانستان ، ایران ، سندھ، اور ہندوستان میں شورشیں بلند ہورہی تھیں اوران خطوں میں بیرونی مداخلت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔خصوصاً ہندوستان کی وسیع وعریض مغل سلطنت پانی پت کی تیسری لڑائی 1761ء(2) کے بعد مغل حکمران کسی بھی بیرونی جارحیت کے خلاف مزاحمت کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ پانی پت سے قبل مرہٹوں نے ان کا بھرکس نکال دیا تھا اور مرہٹوں کی شکست کے بعد افغانوں نے انہیں بے یارومددگار ایسٹ انڈیا کمپنی کے غیر ملکی تاجروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھالہٰذا اب مغل ایک ایسے خطے کے حکمران تھے کہ جس پر انہیں

کوئی اختیار نہیں تھا اور پورے ملک میں انگریزوں کے احکامات کی پیروی ہونے لگی تھی۔ انگریز آہستہ آہستہ برصغیر کی سیاست ومعیشت پر حاوی ہونے لگے اور آخر کار انہیں ہندوستان جیسی ایک عظیم معاشی منڈی پر قبضہ حاصل ہوا۔ اس عظیم خطے پر دسترس حاصل کرنے کے باوجود ان کی ہوس ملک گیری کی خواہش میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ مزید ممالک پر قبضہ کرنے کے لئے آگے بڑھتے گئے۔ برطانوی حکام کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ اپنی سرحدیں روس کے ساتھ ملا کر نہ صرف اس کے آگے بڑھنے کی راہیں مسدود کردی جائیں بلکہ دنیا کی عظیم ترین مملکت قائم کرنے کا اعزاز بھی حاصل کرسکیں۔ مورخین کے مطابق برطانیہ نے روس کو برطانوی ہندوستانی مقبوضات سے دور رکھنے کے بہانے افغانستان پر حملہ اور قبضہ کرنے کی پالیسی ترتیب دی۔ (3) مگر دراصل طاقتور قوتیں ہمیشہ مختلف حیلوں بہانوں اور الزام تراشیوں کو سبب بنا کر آزاد اور خودمختار ممالک پر قبضہ کرتی ہیں اور یہ قانون ازل سے اسی طرح چلا آرہا ہے۔ طاقتور کو کہیں پر حملہ کرنے یا قبضہ کرنے یا ان دونوں مقاصد کے حصول کے لئے بہانے تراشنے سے کمزور اور نہتے ممالک روک نہیں سکتے۔ لہٰذا برطانیہ نے بھی اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اپنی توسیع پسندانہ پالیسی کو روسی جارحیت کے بہانے افغانستان پر قبضہ کرنے کی پالیسی کو حتمی شکل دی۔ مگر یہ پالیسی اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ ہندوستان اور افغانستان کے مابین آزاد اور خود مختار ریاستوں کو کچلا نہ جاتا یا پھر انہیں معاہدات کے ذریعے راستہ دینے پر رضا مند نہ کیا جاتا۔ لہٰذا ان خطوں یعنی سندھ وبلوچستان میں انگریزوں نے اپنے جاسوسی نیٹ ورک کا جال پھیلانا شروع کیا۔ برطانوی مقاصد کا ذکر تو گذشتہ سطور میں ہوا کہ وہ

صرف اپنی ہوس ملک گیری کی خواہش پوری کرنے کی خاطر آزاد اور خود مختار خطوں پر چڑھ دوڑا البتہ انگریز جاسوسوں کے مقاصد ان کے سپاہیوں اور جرنیلوں سے بھی زیادہ کریہہ اور مکروہ تھے۔انہیں برطانوی حکام اور اختیارداروں کی جانب سے سندھ، بلوچستان اور افغانستان کے فوجی، سیاسی، جغرافیائی حالات معلوم کرنے کی غرض سے مذکورہ بالا خطوں کی جانب بھیجا گیا تھا مگر اس کے علاوہ ان جاسوسوں نے مزید کئی موضوعات پر کام کیا اور ان آزاد خطوں میں انتشار پھیلایا۔

برطانوی جاسوسوں کے عزائم ان کی اپنی تحریروں سے واضح ہوتے ہیں۔ ان کے عزائم پر روشنی ڈالنے سے قبل ان کی آمد کا تذکرہ ضروری ہے یعنی یہ کہ وہ کون تھے۔وہ کیا کام کرتے تھے اور بلوچستان میں ان کی آمد کب اور کہاں کہاں سے شروع ہوئی۔

انگریزوں نے اپنی جاسوسی مہمات برائے بلوچستان کا آغاز 1795ء میں کیا جب انہوں نے غلام سرور نامی ایک شخص کو سفر خرچ اور دوسری سہولیات دے کر بلوچستان اور سیستان کے حالات معلوم کرنے کی غرض سے ان خطوں کی جانب روانہ کیا(4) غلام سرور ایک سال تک بلوچستان اور سیستان میں مہم جوئی کرتا رہا اور یہاں کے جغرافیائی، سیاسی، معاشرتی، فوجی اور معاشی حالات کے بارے میں معلومات اکٹھا کرتا رہا اور ایک سال بعد یہ تمام معلومات اس نے بمبئی میں تعینات برطانوی حکام تک پہنچادی (5) غلام سرور کی حاصل اور مہیا کردہ معلومات کی روشنی میں برسوں برطانوی حکام واہل کار سوچتے رہے اور آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیتے رہے اور بلوچستان کی عظیم وسعتوں، وادیوں، پہاڑی سلسلوں، میدانی بھول بھلیوں اور دشتوں میں مہم جوئی کے لئے مناسب افراد تلاش کرتے رہے اور ساتھ

ہی بلوچستان وسیستان میں سفر کرنے اور ممکنہ خطرات کی تمام تر جزئیات کا مطالعہ کرتے رہے۔ آخر کار 1809ء میں انگریزی حکام نے اپنے تین فوجی افسروں کا اس خطرناک مہم کے لئے انتخاب کرلیا ان فوجی افسران میں لیفٹیننٹ ہنری پوٹینگر، لیفٹیننٹ گرانٹ اور کیپٹن کرسٹی شامل تھے۔ علاوہ ازیں افغانستان کے لئے الفنسٹن، میلکم، ڈیری، میلسن کا انتخاب کیا گیا جبکہ ایران کے لئے پرسی مونسورتھ سائیکس کو منتخب کیا گیا۔ ان کے علاوہ بھی ان خطوں میں جاسوسی یا سرکاری خدمات بجالانے کے لئے کئی دیگر برطانوی فوجی اور سول افسران کو بھیجا گیا جو مختلف طریقوں سے اپنے ملک وقوم کی خدمات بجالاتے رہے اور برسوں تک اپنے فوجیوں اور حاکموں کی خوشنودیاں حاصل کرتے رہے۔ اپنی مہمات کی تکمیل کے بعد ان برطانوی جاسوسوں میں سے اکثر نے اپنے تجربات اور سفر کے حالات وواقعات کو تحریری شکل دی اور انہیں شائع کروایا ان جاسوسوں کی اپنی تحریروں سے ہی ان کے عزائم واضح ہوتے ہیں۔ اگر ایک طرف ان کی حکومتوں نے انہیں جغرافیائی اور فوجی مقاصد کے حصول کی ممکنات کے بارے میں معلومات کی غرض سے ان مذکورہ خطوں کی جانب بھیجا تھا تو دوسری طرف ان جاسوسوں نے کئی دیگر موضوعات کو بھی اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے جو ان کو تفویض کردہ اختیارات سے تجاوز کی واضح نشاندہی کرتے ہیں۔ ان جاسوسوں کی تحریروں سے ایک طرف اگر ان کے مکروہ عزائم کی وضاحت ہوتی ہے تو دوسری طرف اس خطے اور یہاں بودوباش رکھنے والوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

مورخین کے مطابق بلوچستان میں داخل ہونے والا پہلا یورپی باشندہ سکندر اعظم تھا جو 326 ق م میں اپنی ہندوستانی مہم سے واپسی پر سندھ سے ہوتے ہوئے

بلوچستان کے جنوبی خطوں یعنی لسبیلہ اور مکران میں سے ہوتے ہوئے عازم ایران ہوا تھا(6) مگر یہاں ذرا تصحیح کی ضرورت ہے کیونکہ جدید تحقیق اور تاریخی ذرائع یہ ثابت کرتے ہیں کہ بلوچستان یونانی مداخلت سے بھی بہت پہلے سے ایک تجارتی گزرگاہ تھی لہٰذا ممکن ہے کہ سکندر سے قبل کئی دیگر یورپی مہم جوؤں نے اس خطے میں مداخلت کی ہو۔ گو کہ وسیع پیمانے پر ایسی معلومات ناپید ہیں مگر بابائے تاریخ ہیروڈوٹس کی مشہور زمانہ کتاب تاریخ ہیروڈوٹس History of Herodotes کے مطابق ہیروڈوٹس نے بذات خود ایک سرکاری آفیسر اور اہم ترین نمائندے کے طور پر اس خطے کی سیاحت کی تھی۔ اپنی کتاب میں وہ بلوچستان کی جغرافیائی حالات کے ساتھ ساتھ بہت سے اہم بلوچ قبائل کا تذکرہ بھی کرتا ہے(7) اسی طرح مکران کے ساحلوں پر برطانوی مداخلت سے قبل پرتگیزی قزاقوں نے حملے کئے اور یہاں کالونی یعنی نوآبادیات بنانے کی کوشش کی تو مکران کے سپوتوں نے انہیں ساحلوں پر ٹکنے نہیں دیا اور شدید ہزیمت دے کر بھاگنے پر مجبور کیا۔ (8) بہر حال پوٹینگر اور کرسٹی اہم برطانوی نمائندوں کی حیثیت سے مگر بھیس بدل کر بلوچستان میں داخل ہوئے اور بلوچستان کی آنے والی تاریخ کو بدلنے کا سبب بنے۔ اگر ان کا کردار دیکھا جائے تو بالکل وہی تھا کہ جو میجر لارنس نے مشرق وسطیٰ میں ادا کیا تھا اور اسلامی خلافت کو نہ صرف توڑنے کا سبب بنا تھا بلکہ عرب ترک تنازعہ بھی اسی نے پیدا کیا تھا(9) بالکل اسی طرح پوٹینگر نے بلوچستان میں بلوچ براہوئی تنازعہ کو پیدا کیا اور اس کے سبب بلوچستان میں آگ لگانے کی مذموم کوشش کی کہ جو ان کو تفویض کرنے والی ذمہ داریوں میں شامل نہیں تھا۔

1910ء میں پوٹینگر اور کرسٹی کا بلوچستان میں ورود ہوا خود پوٹینگر کے مطابق،

"شام گئے کرسٹی اور میں 2 جنوری 1810ء کو ایک چھوٹی سی مقامی کشتی میں بمبئی کی بندرگاہ سے سوار ہوئے جو ہمیں سونمیانی بندر تک پہنچانے کے لئے کرائے پر لی گئی تھی یہ فوراً ہی روانہ ہوگئی۔ اگلی صبح طلوع آفتاب پر ہم نے دیکھا کہ ہماری جماعت ماجھیوں کو چھوڑ کر دو ہندوستانی ملازموں سندر جی کے گماشتہ اور اس کے نوکر اور گھوڑوں کے متعدد افغان سوداگروں پر مشتمل تھی جو اپنے وطن کو واپس جا رہے تھے اور جنھیں ہم نے یہ سوچ کر بٹھا لیا تھا کہ ان کی آشنائی اترنے پر کارآمد ہوگی۔(10)

وہ مزید لکھتا ہے کہ:

"جب ہم ساحل سے روانہ ہوئے تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا اور چونکہ ایک تازہ بتازہ نسیم بحری چلنے لگی اور ہم رات گئے سوار ہوئے تھے لہذا ہمیں ہمسفروں کے پا لینے کا خطرہ کم تھا پھر بھی ہم نے ایسے کامیابی سے بھیس بدلا اور یورپی لباس کو مقامی لباس سے تبدیل کیا کہ افغان ہمیں رنگ کے اعتبار سے یورپی سمجھنے کے باوجود ہمارے اصل کرداروں پر ذرہ بھر بھی شک نہ کر سکے۔ ان میں سے دو تین ہمیں ذہین اور شائستہ معلوم ہوئے اور انہوں نے ایسی معلومات بہم پہنچائی جو فوری طور پر دلچسپ تھیں اور بعد میں ہمیں منصوبے بنانے کے لئے بہت ممدو معاون ثابت ہوئیں۔"(11)

درج بالا دو اقتباسات ہی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان نووارد برطانوی جاسوسوں کی نیت کتنی خراب تھی اور وہ کتنے خطرناک ارادوں کے ساتھ بلوچستان کی جانب بڑھ رہے تھے گو کہ وہ بظاہر سیاح تھے مگر وہ جانتے تھے کہ انہیں اپنی سلطنت کی عظمت کو چہار سو پھیلانے کے لئے ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں کہ وہ سیاحت کے ذریعے اپنے ہدف کو پالیں اور خطہ بلوچستان وسیستان وافغانستان سمیت ایرانی خطے کا

سیاسی وجغرافیائی جائزہ لیں اور ساتھ ہی ساتھ ان جاسوسوں نے اپنی ذہنی استعداد کے مطابق برطانوی سامراج کے لئے راستہ صاف کرنے کے امکانات کا جائزہ لے کر اپنی حکومتوں کو اطلاع فراہم کرنا تھا ان کی ذہنی استعداد نے یہاں پر مستقبل میں کئی سوالات کو جنم دیا اور کئی قومی اور جغرافیائی مسائل پیدا ہوئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ انگریز جاسوسوں کی تمام تحریریں اور بیانات درست ہوں یہ ذہن میں رہے کہ ان کا مقصد جاسوسی کرنا تھا اور وہ جو کچھ تحریر کررہے تھے اپنے ملکی وقومی مفادات کے حصول کی خاطر کررہے تھے۔ وہ ہر ممکن کوشش سے یہاں کے مقامی ماحول کے لئے مسائل جبکہ اپنے آقاؤں، حکمرانوں اور جرنیلوں کے لئے آسانیاں پیدا کررہے تھے۔ ان بیانات کی درستگی یا غیر درستگی کا اندازہ ان کی اپنی تحریروں سے ہوجاتا ہے مثلاً پوٹینگر اپنے سفرنامے میں نوشکی کے قریب سنگ مرمر کی موجودگی کی نشاندہی کرتا ہے(12) جو مستقبل میں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی اور آج ان پہاڑوں سے بھاری مقدار میں سنگ مرمر حاصل کیا جارہا ہے۔ مگر اس کے بعض بیانات حقائق کے بالکل برعکس ہیں۔ مثلاً قبلہ کو حضور پاکؐ کا مزار بتانا، مسلمانوں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ گوشت کے ہر لقمہ کو کھانے کے بعد منہ دھوتے ہیں۔ حضور پاکؐ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ جب بیرون ملک نکلتے تھے تو کئی ممالک کا چکر کاٹتے تھے ہندوستان کے قدیم شہنشاہوں کو باختری (سیلوکسی) آشکانی اور ساسانی حکمرانوں کا باجگزار بتانا (13) حتیٰ کہ وہ شکست خوردہ خوارزم (علاؤالدین خوارزم شاہ اور جلال الدین خوارزم شاہ) کے متعلق یہ لکھتا ہے کہ انہوں نے منگولوں کو ایران سے نکال کر سندھ میں آباد ہونے پر مجبور کیا تھا(14) اس طرح کے بے معنی اور غلط قسم کے بیانات کی برطانوی تحریروں میں بھرمار ہے۔ حالانکہ یہ وہ موضوعات تھے کہ جو ان کے فوجی مشن کا حصہ نہیں تھے مگر انہیں اپنی استعداد کے مطابق ان علاقوں میں

بے چینی اور انتشار پیدا کرنے اور پھوٹ ڈالنے کی اجازت تھی۔لہٰذا وہ اسی طرح کی بے تکی باتوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

پوٹینگر اور کرسٹی بمبئی سے گجرات اور پھر 10 جنوری 1810ء کو بلوچستان کے حدود میں داخل ہوئے اپنی 10 جنوری کی روداد میں وہ لکھتا ہے کہ،

''اسی دن شام کو 8 بجے ہم راس مواری (موتر) اور جزیرہ چرنا (چلنی) کے درمیان سے گزرے۔ہمارا سفر وسطی رودبار پر تھا جو پون میل (ایک چوتھائی) سے زیادہ لمبی نہیں ہے۔لیکن گہری اور خطرے سے محفوظ ہے چاندنی میں جزیرہ اور مقابل کنارہ ویران معلوم ہوتا تھا اور اول الذکر میں نہ تازہ پانی ہے اور نہ ہی کسی قسم کی روئیدگی۔اب ہم خلیج سونمیانی (بلوچستان) میں داخل ہوئے اور جو ایک طرف راس مواری اور جزیرہ چرنا اور دوسری طرف راس عربو (عربہ) سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ ایک نفیس چادرآب ہے جس میں چٹانیں اور خفیہ رکاوٹیں نہیں ہیں اور بڑے سے بڑا بیڑہ بھی یہاں لنگر انداز ہو سکتا ہے۔مشہور ہے کہ یہ نیارکس (نیروخس) کا مستقر رہا اور وہ یہاں کچھ عرصہ قیام پذیر رہا۔ڈاکٹر ونسنٹ نے ایرئین کی سند پر بندر اسکندر کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اصل سے اتنی مشابہ ہے کہ یونانی مورخ کی ثقاہت وصداقت کا واضح ثبوت ہے۔''(15)

16 جنوری کو پوٹینگر اور کرسٹی سونمیانی میں ایک گاؤں میں ٹھہرے اور یہیں سے انہوں نے اندرون ملک داخل ہونے کی حکمت عملی کو آخری شکل دی۔ اور براستہ لسبیلہ جانب قلات عزم سفر کرلیا حالانکہ ان کے ایک قندھاری سوداگر رفیق سفر نے اس راستے پر ممکنہ طور پر خطرات کے پیش آنے سے انہیں متنبہ کیا اور خود ان کا ساتھ چھوڑ دیا مگر یہ دونوں مہم جو فوجی اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کسی بھی قسم

کے خطرے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے راستے پر گامزن رہے اور 21 جنوری کو اوتھل اور 22 جنوری کو بیلہ میں داخل ہوئے (16) ہر مقام پر ان کا استقبال ہندوستان کے ایک بنیئے سندر جی کے ہندو گماشتے کررہے تھے کہ جو اٹھارہویں صدی میں بلوچستان میں تجارت کے تمام ذرائع پر قابض تھے۔ اپنے مذموم مقاصد کے حصول کی خاطر پوٹینگر اور اس کے ساتھی کرسٹی نے بہروپ بدلا تھا اور وہ ایک گھوڑے کے تاجر کے بھیس میں سفر کررہے تھے۔ جب وہ لسبیلہ میں جام آف لسبیلہ سے ملے تو جام نے ان سے کئی سوالات کئے۔ پوٹینگر لکھتا ہے کہ:

”اس نے ہمارے نظریات وعزائم پر استفسار کیا اور ہم نے اسے ذرا تفصیل سے بتایا کہ ہم بمبئی کے ایک ہندو سوداگر سندر جی کے ملازم تھے جس نے ہمیں ہندوستانی منڈی کے لئے گھوڑے خریدنے کے لئے بھیجا تھا۔ آخر میں ہم نے استدعا کی کہ وہ ہمیں قلات بھیجنے کے لئے انتظامات فرمادے۔“(17)

پوٹینگر اور دیگر برطانوی مصنفین کی غلط بیانیوں کا اندازہ درج ذیل تحریر سے بخوبی ہوتا ہے کہ جس میں وہ براہوئی قبائل کو ایک طرف تو وحشی اور غیر مہذب خانہ بدوش تحریر کرتا ہے تو دوسری طرف ان کی نفاست، مہمان نوازی، خلوص، حرص وہوس اور لالچ سے مبرا مخلصانہ محبت ان کی صفائی ستھرائی اور امن وسکون کی بات کرتا ہے۔ جس سے اس کے خیالات میں موجود تضاد آشکارا ہوتا ہے۔ لکھتا ہے کہ:

” (3 فروری) غروب آفتاب سے کچھ قبل ہم نے شب بسری کے لئے تین چار براہوئی چرواہوں کے گدانوں کے پاس ڈیرہ ڈالا۔ ان میں سے ایک نے ہمیں بافراط دودھ، ایندھن اور پانی مہیا کیا۔ اس گروہ نے ایک بڑے سلسلہ کوہ کے سائے میں ایک نہایت رومانوی اور پرسکون مقام کو اپنے ڈیرے کے

لئے چنا تھا۔ ان کے طور طریقے معتدل، سادہ اور دل کو موہ لینے والی تھیں اور اس پناہ گاہ میں ان کی واحد کوشش اپنے ریوڑوں کو بھیڑیوں اور لگڑ بگڑوں کے راتوں کو ہونے والے حملوں سے بچانا تھا۔ دن کے وقت بحفاظت چرانا اور صبح وشام ان کا دودھ دوہنا تھااور ان تمام مواقع پر مرد وعورت یکساں طور پر چست اور ماہر تھے۔ ہمارے اترنے سے ذرا ہی قبل ریوڑ گھر لائے گئے تھے اور حیران کن طور پر ان سب کو نہایت عجلت اور باقاعدگی سے دوہا گیا اور باڑوں میں بند کردیا گیا۔ اس وقت ہر شخص سربراہ سے لیکر چھوٹے بچے تک نے کام میں ہاتھ بٹایا بھیڑوں کو بکریوں سے علیحدہ برتنوں میں دوہا گیا کیونکہ ان کے مکھن سے بننے والا گھی دیر پا نہیں سمجھا جاتا جبکہ ان قبائل کے نزدیک یہ تازہ زیادہ تقویت بخش ہوتا ہے جب گھریلو کام پورے ہوگئے تو مستورات اور بچے ہمارے الاؤ کے گرد آگئے اور نہایت بے تکلف گپ شپ کرتے رہے۔ ان خواتین بچوں اور مردوں کے طور طریقوں اور گفتگو سے دوسروں کے کام آنے کی مخلصانہ کوشش وخواہش کا اظہار ہوتا تھا۔ جس میں انعام واکرام کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ ہمیں ان وحشی اور غیر مہذب چرواہوں سے جو حسن وسلوک نصیب ہوا اس کی مسرت صرف وہی محدود چند لوگ محسوس کرسکتے ہیں جو ہماری جیسی صورتحال سے گزرے ہوں۔ اپنے میزبان کی بیٹی کو روٹی پکانے کے لئے کچھ آٹا دینے کے بعد مجھے روٹی کی تیاری یا عدم تیاری کے بہانے گدان کو اندر سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ میں اس غیر معمولی رہائش گاہ کی صفائی اورسکون سے بہت متاثر ہوا۔ یہ چند پتلی خمیدہ چھڑیوں کی ایک محرابی چھت تھی جسے کھردرے اور کالے کمبلوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا جس گدان میں داخل ہوا اس میں بمشکل کھڑا ہوسکتا تھا۔ مجھے اس کی لمبائی اور چوڑائی یکساں طور پر دس یا بارہ گز معلوم ہوئی۔ اس کے فرش پر کھردری دریاں بچھائی ہوئی تھیں، جو خود

براہوئی خواتین کی بافتہ ساختہ تھیں۔ آگ ایک کونے میں تھی اور صرف یہی باعث تکلیف تھی کیونکہ دھواں چمنی نہ ہونے کی وجہ سے دروازے سے نکلتا تھا۔ البتہ اسکا فائدہ یہ تھا کہ اس سے گدان خوب گرم رہتا تھا جو ان غریب، معمولی کپڑے پہنے ہوئے لوگوں کے لئے واقعی ایک بہت بڑا مصرف ہے۔" (18)

درج بالا بیان سے ہنری پوٹینگر کے خیالات وافکار میں موجود تضادات کی واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ جہاں ایک طرف وہ براہوئی قبائل کی معاشرتی وتہذیبی خوبیوں کے گن گاتا ہے تو دوسری طرف انہیں وحشی اور غیر مہذب لکھتا ہے۔ دراصل یہ ایک تاریخی ستم ہے کہ طاقتور اور فاتح اقوام جب کسی مفتوح قوم کی تاریخ لکھتے ہیں تو اس میں مفتوح اور مغلوب کی رائے کو مقدم نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی ان کی رائے کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے بلکہ فاتح ہمیشہ اپنی تلوار کی نوک مفتوح کے خون میں ڈبو کر اپنی مرضی کی تاریخ رقم کرتا ہے۔ اگر انسانی جذبات واحساسات کے تناظر میں دیکھا جائے تو اصل وحشی تو خود یہی یورپی اقوام تھیں اور ہیں کہ جنہوں نے طاقت پکڑتے ہی پوری دنیا میں ایسے اقدامات کئے کہ جن سے انسانیت کی روح تک کانپ اٹھتی ہے۔ برطانیہ نے ہندوستان اور دیگر ایشیائی ممالک بشمول افغانستان وبلوچستان پر کیوں بلاوجہ حملے کئے اور اپنے سو سالہ دور میں لاکھوں انسانوں کو کس جرم کے تحت موت کے گھاٹ اتارا۔ اپنے خوفناک اور جدید ہتھیاروں سے آگ برسا کر ہندوستان، سندھ، خیبر پختونخواہ، بلوچستان، افغانستان اور کئی دیگر آزاد اور خود مختار پرامن ممالک کے گلی کوچوں میں انسانوں کا تن من اور دھن سب کچھ جلا کر خاکستر کردیا مگر اس سارے عمل کے باوجود وہ دنیا کے مہذب ترین لوگ کہلائے۔ پچھلی صدی میں روس نے افغانستان میں انقلاب کے دفاع کے بہانے مداخلت

کر کے دس سالوں میں 30 لاکھ سے زائد افغانوں کا قتل عام کیا اور اتنی ہی تعداد کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر کے دیگر ممالک کی جانب دھکیل دیا جس سے دنیا بھر میں بے چینی اور کھلبلی مچی مگر روس مہذب ترین تھا۔ زیادہ دور نہیں جاتے کیا آج دنیا کا سب سے مہذب ترین اور ترقی یافتہ ملک یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ کے ہاتھ اور سارا جسم ویتنام، انگولا، السلواڈور، لاطینی امریکی ممالک، لیبیا، مصر، فلسطین، عراق اور افغانستان کے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کے خون میں رنگا ہوا نہیں ہے اور پورے امریکہ سے انسانوں کے خون کی بو نہیں آتی؟ مگر اس آلودہ چہرے کے باوجود آج امریکہ دنیا کا مہذب ترین معاشرہ کہلاتا ہے اور درج بالا مظلوم ممالک کی اقوام کو وحشی اور جنگجو قرار دیکر انہیں اپنے تباہ کن آتشیں ہتھیاروں سے بھوننا دنیا وی امن کے لئے ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ یقینا وہ پہاڑی دامنوں میں اپنے اور دوسروں کے لئے امن کا باعث بننے والا چرواہا زیادہ مہذب ہے بہ نسبت اس وحشی اور درندے کے کہ جو اپنے خوفناک اور تباہ کن ہتھیار وعزائم کے ساتھ اپنے خوبصورت محلات کو چھوڑ کر ان معصوم اور پر امن لوگوں کے گدانوں پر حملہ آور ہوا۔ پوٹینگر 9 رفروری کو قلات پہنچا بلا شبہ لسبیلہ سے خضدار و سوراب اور وہاں سے قلات تک کا سفر انتہائی تکلیف دہ تھا مگر ان مہم جوؤں نے ان تکالیف اور پریشانیوں کو اپنی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔

قلات ان جاسوسوں کا اصل مرکز تھا اور وہ بلوچ دارالحکومت کے بارے میں تمام تر معلومات حاصل کر کے اپنے افسروں کو بجھواتے تھے اور بظاہر وہ مسلمان اُزبک گھوڑوں کے سوداگر تھے جیسا کہ کرسٹی نے ایک افغان غلزئی اونٹوں کے تاجر کو کہا تھا کہ:

''ہم ایک ازبک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو کچھ زمانہ قبل ہندوستان میں آباد ہو گیا تھا وہ اس جواب پر مطمئن ہو گیا اور کہنے لگا کہ ہمارے رنگ سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔''(19)

15 رفروری کو نئے سلے ہوئے کپڑے پہن کر دونوں جاسوس قلات شہر میں گھومنے کی غرض سے نکل آئے اور اپنے اصل مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے قلات شہر، قلعہ اور گردونواح سمیت پورے علاقے کا جائزہ لیا پوٹینگر کا جائزہ مکمل فوجی نوعیت کا تھا اور یہی ذمہ داری اسے سونپ کر برطانوی راج نے اسے اور اس کے ساتھی کو قلات اور باقیماندہ بلوچستان کی جانب روانہ کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''یہ شہر پورے بلوچستان کا دارالحکومت ہے اور اس لئے یہ قلات یا شہر کہلاتا ہے جو بلوچی میں اس کا مفہوم ہے۔ یہ ایک سیراب وشاداب میدان یا وادی کی مغربی طرف ایک اونچی جگہ پر واقع ہے جو تقریباً آٹھ میل لمبا اور دو تین میل چوڑا ہے اور جس کا بیشتر حصہ باغات اور دیگر احاطوں پر مشتمل ہے شہر ایک مستطیل مربع صورت میں بنا ہوا ہے اور اس کی تین اطراف کے گرد ایک مٹی کی دیوار ہے جو اٹھارہ یا بیس فٹ اونچی ہے۔ اور جس پر ڈھائی سو قدموں کے فاصلے پر برج بنے ہوئے ہیں۔ برجوں اور دیواروں میں تفنگچیوں کے لئے بے شمار سوراخ ہیں لیکن ان پر توپیں کہیں نصب نہیں اور نہ ہی شاید میرے اندازے کے مطابق یہ شکستہ تعمیرات ان کی متحمل ہو سکتی ہیں۔ شہر کی چوتھی طرف پہاڑی کے مغربی حصے سے محفوظ ہے جس پر یہ جزوی طور پر ایستادہ ہے اور جسے عموداً کاٹا گیا ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر خان قلات بیگلر بیگی بلوچستان، محمود خان کا محل بنا ہوا ہے جہاں سے شہر اور مضافات کا منظر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ مجھے اندرون محل

دیکھنے کا موقع نہ مل سکا لیکن باہر سے یہ عام مٹی کی عمارتوں کا ایک بے ہنگم ڈھیر معلوم ہوتا ہے۔ان کی چھتیں مسطح اور ڈھلوان ہیں جن کی حفاظت کے لئے چھوٹی چھوٹی دیواریں ہیں جو قلعہ کی دیواروں کی طرح سوراخ دار ہیں۔

پہاڑی کے اس حصے کے گرد ایک برجدار خا کی دیوار بنی ہوئی ہے جس پر خان کا محل واقع ہے۔اس کی حالت دیگر قلعہ بندیوں کی نسبت بہتر ہے اور میرے خیال میں مجموعی طور پر یہ قلعہ تھوڑی سی مزید توجہ سے بلوچستان بھر میں دفاعی طور پر محفوظ ترین بنایا جاسکتا ہے۔اس کا باب داخلہ جنوب مغربی طرف ہے اور یہاں مستقلاً تفنگچیوں کا ایک حفاظتی دستہ ہوتا ہے۔شہر کے تین دروازے ہیں جو خانی، قندھاری اور بیلائی کہلاتے ہیں۔آخری دونوں قندھار اور بیلہ جانیوالی سڑکوں پر موسوم ہیں اور پہلا خان سے منسوب ہے۔ان دروازوں پر بھی حفاظتی دستے متعین ہیں فصیل کے اندر ڈھائی ہزار سے زیادہ مکانات ہیں اور مضافات میں ان کے نصف سے زیادہ ہوں گے۔ وہ نیم سوختہ اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں جو چوبی ڈھانچوں پر لگی ہوئی ہیں اور ان پر گارے چونے کا پلستر ہوا ہے۔گلیاں عموماً دیگر مقامی قصبوں کی نسبت زیادہ چوڑی ہیں اور ان کے دورویہ پا پیادہ لوگوں کے لئے اونچی پگڈنڈیاں بنی ہوئی ہیں لیکن ان کے وسط میں کچرہ دان ہے جس میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے اور بارش کا بدبودار پانی بھی اس میں رکا رہتا ہے لہٰذا یہ وبال جان بنی ہوئی ہے کیونکہ اس کی صفائی کے کوئی سخت انتظامات واحکامات نہیں ہیں۔ایک اور مشکل (جو شہر کی صفائی اور آرام کو متاثر کرتی ہے) یہ ہے کہ مکانات کی بالائی منزلیں گلیوں کے اوپر تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کے نچلے حصے تاریک اور مرطوب رہتے ہیں یہ اصل میں ایران اور کابل کے بازاروں کی بے حد بھونڈی تقلید ہے۔"(20)

پوٹینگر اپنا جائزہ جاری رکھتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ :

"قلات کا بازار وسیع ہے اور ہر قسم کے سامان سے معمور ہے۔ گوشت سبزیاں اور دیگر ضروریات زندگی مناسب قیمت پر دستیاب ہیں۔ میدان کے مقابل پہاڑی کا ایک چشمہ شہر کو لذیذ پانی مہیا کرتا ہے، اور شہر بمعہ مضافات اور باغات کے بیچوں بیچ بل کھاتا ہوا گذرتا ہے۔ پانی کا دھارا اتنا تیز اور بھرپور ہے کہ چوتھائی میل طے کرنے سے پہلے پہلے اس سے بہت سی پن چکیاں چلتی ہیں۔ اس کا منبع چٹان کے ایک قدرتی غار میں واقع ہے۔ جس کے اندر میں دس بارہ گز تک گیا یہاں دو تین فٹ گہرا دھارا آئینہ کی طرح شفاف اور بہت تیز ہے یہ یہاں سے ہی چار پانچ شاخوں میں بٹ جاتا ہے جن کے بہاؤ کے راستے اتنے نشیبی اور تنگ ہیں کہ آگے نہ جاسکا۔ اس سے زیادہ مملو چشمہ میری دید وشنید میں نہیں آیا۔ ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ چشمے کا پانی چھوٹی نالیوں سے نکلنے کے بعد طلوع آفتاب کے بعد تک اچھا خاصہ نیم گرم ہوتا ہے اور پھر یکلخت ٹھنڈا ہوجاتا ہے اور سارا دن ٹھنڈا ہی رہتا ہے۔"(21)

پوٹینگر کی درج بالا آرا اور قلات کا جائزاتی نقشہ مکمل طور پر فوجی نقطہ نظر کی عکاس ہے پورے بازار میں گھومتے ہوئے بھی اس کی نظریں قلات کے قلعہ کے دیواروں اور اندرون فصیل تعمیرات اور ان کی فوجی نقطہ نظر سے اہمیت پر لگی ہوئی تھیں ۔ وہ ہر چیز کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور برطانوی افواج کے ممکنہ حملے کے طور پر قلات کے دفاعی پوزیشن کو دیکھ رہا تھا وہ خود اپنے ارادوں اور منصوبوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہے کہ:

"ہم روز نہایت اشتیاق سے ان ممالک کے جغرافیہ اور ماہیت کے متعلق معلومات اندوزی کرتے رہے جن سے ہمارا آئندہ راستہ گزرنا تھا۔"(22)

قلات میں کچھ عرصہ مزید قیام کرنے اور ضروری معلومات جمع کرنے کے علاوہ اگلی منزل اور راستوں کا تعین کرنے کے بعد یہ بہروپیئے اپنے سامان تجارت، ہندو گماشتوں اور افغان تاجروں سمیت آگے نکل گئے۔ حتیٰ کہ پورے بلوچستان اور سیستان کی سیاحت کی اور ہر جگہ کے بارے میں ضروری معلومات اکٹھا کرتے رہے یہ لوگ نوشکی اور قندھار بھی گئے اور وہاں کے معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ دفاعی استحکامات اور انتظامات کا بھی جائزہ لیا۔ وہ جہاں جاتے وہاں کے معتبرین تک رسائی حاصل کرتے۔ ان کی محفلوں میں بیٹھتے اور ان سے اپنے مقاصد سے متعلق معلومات حاصل کرتے۔ تجارتی رستوں، اہم شہروں اور قصبوں، قبائل اور ان کے طرز عمل، پانی اور خوراک کے ذرائع وغیرہ کے بارے میں معلومات اکٹھا کرتے۔ ایسے لوگوں سے ملتے کہ جنہوں نے ان کے مطلوبہ علاقوں میں سیاحت کی ہوتی۔ وہ ایسے لوگوں سے مختلف قسم کے سوالات کرتے اور ضروری معلومات حاصل کرتے اور ان معلومات کی روشنی میں اپنے آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیتے۔

کیپٹن چارلس کرسٹی اور لیفٹیننٹ ہنری پوٹینگر کے راستے نوشکی سے الگ ہوگئے اور کیپٹن کرسٹی 22 مارچ 1810ء کو نوشکی سے کرمان کے لئے روانہ ہوا جبکہ ہنری پوٹینگر 25 مارچ 1870ء کو نوشکی سے ہرات کی جانب روانہ ہوا۔ قدم قدم پر ان کی مہمان نوازی بلوچ قبائلی معتبرین کر رہے تھے مگر وہ بے قصور تھے کیونکہ ان مکار انگریزوں نے مسلمان تاجروں کا بہروپ بھرا تھا اور وہ اپنے سرخ وسفید چہروں سے ایرانی یا وسط ایشیائی مسلمان لگتے تھے۔ ان کی رہنمائی اور مالی مدد ہندو ساہوکار اور گماشتے کر رہے تھے کہ جنکی جڑیں بمبئی میں پیوست تھیں۔ اس پورے کھیل میں ماسوائے چند لوگوں کے بہروپیوں کا اصل کردار کسی کو معلوم نہ تھا حتیٰ کہ تمام ضروری معلومات جمع کر کے یہ دونوں بحفاظت بلوچستان کے حدود سے نکل گئے۔ کیپٹن

کرسٹی بعد ازاں 31اکتوبر 1812ء میں روس ایران سرحد پر روسی دستے کے ایک حملے میں مارا گیا۔ جبکہ پوٹینگر افغانستان سے کرمان، سینا، کرمان شاہ ہوتے ہوئے بغداد اور بالآخر 6فروری 1811ء کو بمبئی پہنچا۔ (23) کرسٹی کے مرنے کی اطلاع بھی اسے یہیں پر ملی۔

تاریخ کا ستم ازل سے جاری ہے اور ہمیشہ طاقتور اور مادی طور پر مضبوط اقوام وممالک مزید وسائل پر قابض ہونے، اپنے جغرافیائی حدود کو بڑھانے اور نمبرون آنے کی دوڑ میں لگی رہتی ہیں۔ انہیں پر امن اور غیر جانبدار ممالک واقوام پر قابض ہونے کے لئے محض بہانے چاہیے ہوتے ہیں۔ یہ طاقتور اور سامراجی عزائم رکھنے والے ممالک اُن ممالک میں جہاں یہ قابض ہونا چاہتے ہیں سب سے پہلے اپنے جاسوس بھیجتے ہیں جو مطلوبہ اور ضروری معلومات اکھٹا کرنے کے ساتھ ساتھ ان خطوں میں اندرونی توڑ پھوڑ کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں اور لوگوں کی خرید وفروخت بھی کرتے ہیں۔

پوٹینگر اور کرسٹی کو ہم اولین جاسوس کہہ سکتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے تحریری ریکارڈ شائع کروائے۔ گو کہ ان سے بہت قبل عباسی دور میں لاتعداد عرب سیاحوں نے بھی اس خطے کی بھرپور سیاحت کی اور اپنے تحریر میں یہاں کے بارے میں بے شمار معلومات فراہم کیں مگر وہ جاسوس نہیں بلکہ صرف سیاح تھے البتہ کافی حد تک ان کی تحریروں سے بھی فاتح ہونے کی بو آتی ہے۔ جبکہ پوٹینگر کو باقاعدہ ایک مشن پر بھیجا گیا تھا اور اس کا مقصد ہی فوجی نوعیت کی معلومات فراہم کرنا تھا اپنے اصل مقصد کی فراہمی کے ساتھ ساتھ اس فوجی نے بلوچ تاریخ اور ثقافت پر بھی ناکام طبع آزمائی کی اور اپنی تحریر میں بہت سی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا کرنے

کی کوشش کی ۔ اس نے بلوچ کی تشریح ناکام طور پر صرف نسلی بنیاد پر کرنے کی سعی کی اور براہوئی کو بلوچ سے الگ کرنے کی کوشش کی اور یہ تفریق اس نے صرف زبان کے اختلاف سے پیدا کرنے کی جسارت کی (24) حالانکہ وہ یہ بھول گیا کہ جس قلات میں وہ کئی دن رہا اور جس کا اس نے انتہائی دقیق اور عمیق طرح سے جائزہ لیا وہاں کا حکمران براہوئی خانوادہ سے تعلق رکھتا ہے اور وہ خان بلوچ کہلاتا ہے نہ کہ خان براہوئی یا خان بلوچستانی ۔ وہ تو اپنی قومی شناخت کو ظاہر کرتے ہیں نہ کہ قبائلی یا علاقائی شناخت کو ان خوانین کے مقبروں پر بھی خان بلوچ کے الفاظ تحریر ہیں اور ان کے مہروں پر بھی خان بلوچ تحریر ہے (25) حالانکہ پوٹینگر کی تحریر سے قبل لفظ براہوئی کسی بھی مستند تاریخی مسودے یا کتاب میں نہیں ملتا البتہ ہزاروں سال قبل یونانیوں نے اس خطے کو اریبوئی یا اربوئی تحریر کیا اور اس میں رہنے والے قبائل کو بھی اربوئی یا اریبوئی لکھا حتیٰ کہ ان کے پانی کا وسیلہ بھی اریبیئس (دریائے پورالی) کہلاتا تھا (26) یقیناً اس شاطر اور مکار انگریز نے اسی لفظ کو الٹ پلٹ کر براہوئی بنادیا اور زبان کو بنیاد بنا کر ان قبائل کے اجتماع کو توڑنے کے لئے انہیں بلوچ اور براہوئی میں تقسیم کیا۔ یقیناً ماہر لسانیات بہتر طور پر کہہ سکتے ہیں کہ آیا لفظ اربوئی یا اریبائی یا اریبوئی (جسے انگریزی میں Ariboi تحریر کیا گیا ہے)(27) آسانی کے ساتھ لفظ براہوئی میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا ۔ جبکہ میر گل خان نصیر (28) اور بعض دیگر دانش ور لفظ برزکوہی کو براہوئی کی ابتدائی شکل کے طور پر تسلیم کرتے ہیں ۔ اگر لفظ برزکوہی براہوئی میں تبدیل ہوسکتا ہے تو لفظ اربوئی ، براہوئی میں کیوں تبدیل نہیں ہوسکتا جبکہ اول الذکر میں صوتی پیچیدگیاں بھی بہت ہیں جبکہ ثانی الذکر میں تبدیلی کے وقت بظاہر بڑی پیچیدگی نظر نہیں آتی ۔ اس کے علاوہ اس نام کے تاریخی ماخذ اور مستند ذرائع بھی موجود ہیں جبکہ لفظ

برز کوہی کا کوئی تاریخی حوالہ نہیں ملتا۔ ایک اور مستند ذریعہ اس خوبصورت اور قدیم تفریح گاہ کو بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو اربوئی نامی پہاڑ ہیں اربوئی کے نام سے واقع ہے۔ یقینا یہ دلائل اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ پوٹینگر کے آنے سے براہوئی اور بلوچ کے حوالے سے نہ تو بلوچستان میں تاثر موجود تھا اور نہ ہی ایسا کوئی تاریخی حوالہ ملتا ہے یقینا یہ اسی شاطر اور مکار جاسوس کی سازش تھی کہ مستقبل میں اپنی فوجوں کا راستہ ہموار کرنے کی خاطر اگر بلوچستان میں خانہ جنگی کی آگ لگانے کی ضرورت پیش آئی تو اس کے لئے جواز پہلے سے موجود ہونا چاہیے۔ اس مکار نے ہر طرح سے بلوچ تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی اور بلوچوں کو صرف تین قبائل یعنی ناہروئی، رند اور مگسی تک محدود کیا (29) اسی طرح اپنی کتاب میں ایک اور تاریخی غلطی کرتا ہے اور بلوچستان کو بلوچوں کے لئے نادرشاہ کے عطیہ سے منسوب کرتا ہے لکھتا ہے کہ:

"یہ سارا بسیط علاقہ کسی وقت خان قلات کے والد نصیر خان کی مملکت تھا جو اسے ایرانی فاتح نادرشاہ نے 1739 میں عطا کیا تھا اور اسے بیگلر بیگ بلوچستان کا لقب بھی دیا تھا۔"(30)

یقینا اس ایک بیان میں بہت ساری غلطیاں ہیں یعنی یہ کہ میر نصیر خان 1739ء میں نادرشاہ کے پاس بطور یرغمالی شہزادے کے موجود تھا اور وہ 1749ء میں قلات میں برسر اقتدار آیا جبکہ نادرشاہ افشار 1747ء میں اپنے بھتیجے کے ہاتھوں ایران میں قتل ہوا اور بیگلر بیگی کا خطاب نصیر خان کو خلافت عثمانیہ نے عطا کیا تھا نہ کہ نادرشاہ افشار نے۔ جبکہ میر عبداللہ خان 1731ء میں کلہوڑوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا تھا اور ان کے بعد ان کے بیٹے میر محبت خان کو خان بنایا گیا تھا کہ

جسے اس کے بھائی میر اہلتاز خان نے 1733ء میں معزول کر کے اقتدار پر قبضہ کرلیا تھاالبتہ میر محبت خان نے 1736ء میں نادرشاہ کی حمایت سے اہلتاز خان کومعزول کردیااوراقتداردوبارہ اپنے قبضہ میں کرلیا تھا۔ علاوہ ازیں بلوچ قبائل اس سارے خطے میں کہ جوموجودہ وقت تین مختلف مما لک پاکستان ایران اور افغانستان میں منقسم ہےاور پاکستان میں اس کے بعض حصے صوبہ سندھ، پنجاب اورخیبر پختونخواہ میں بھی شامل کئے گئے ہیں ،عرصہ دراز بلکہ زمانہ ماقبل از مسیح سے آباد ہیں اورآرین حملوں کے وقت بھی وہ اپنے ان ہی مخصوص علاقوں میں آباد تھے تاریخ میں قدیم ایرانی خاندانوں سے لیکر تا حال بلوچوں کا ذکر اسی سرزمین پر تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔تاریخ کی کئی مستند کتب مثلاً شاہنامہ فردوسی ،تاریخ سیستان (فارسی) کتاب المما لک المسالک،صورۃ الارض،تاریخ ابن خلدون،تاریخ ہیروڈوٹس،ایرین اور سٹریبوکی تواریخ،سکندر کے سفرنامے سے متعلق کتب،ہنخامنشی، ساسانی،عرب اور وسط ایشیائی غزنوی، سلجوقی اورغوری خاندانوں کی تواریخ ، حتیٰ کہ کئی دیگر مشہور و معروف کتب تواریخ میں بلوچوں کا ذکر تسلسل کے ساتھ ملتا ہے اور ہر دور میں مورخین نے انہیں موجودہ جغرافائی حدود کے اندر بیان کیا ہےاور ساتھ ہی ان کے جنگی کارناموں سے بھی تاریخ کے صفحات مزین ہیں۔لہذا پوٹینگر کی یہ رائے کہ یہ علاقے نادرشاہ افشار نے بلوچوں کوعطیہ کیے سراسر بے بنیاد اور تاریخی حقائق کے منافی ہے۔

اس طرح کی کئی تاریخی اغلاط ان مغربی مورخین کی کتب میں ملتی ہیں کہ جن کی وجہ سے ان کتب کا استناد متاثر ہوتا ہےاور محققین ایسے مواد کو قابل بھروسہ نہ سمجھ کرانہیں درخوراعتنانہیں سمجھتے۔دراصل یہ برطانوی بہروپیے بنیادی طور پر فوجی تھے اوران کا علم تاریخ سے دور دور تک کا واسطہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس علم کے ابجد اور

طریقہ کار سے واقف تھے نہ ہی وہ تاریخی تحقیق کا فن جانتے تھے اور نہ کبھی انہوں نے تاریخ نویسی کی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں تاریخی واقعات بیان کرتے وقت یا نسلی تاریخ تحریر کرنے کے لئے کسی بھی قسم کا حوالہ نہیں ملتا اور نہ ہی انہوں نے اس کے لئے کسی حوالے کی ضرورت محسوس کی۔

اس سلسلے میں ایک مصنف لکھتا ہے کہ،

"یوں تو بلوچوں کی نسلی اصلیت کے بارے میں مختلف مؤرخین نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ان میں سے ہر ایک نے اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ بلوچوں کے اصل نسلی ماخذ کو اجاگر کیا جا سکے اس مقصد کیلئے ان مؤرخین نے دلائل کے ساتھ اپنی رائے دی ہے مگر یہ تمام مؤرخین کسی ایک نقطے پر متفق نہیں ہیں بلکہ اولاً یہ کسی ایک مخصوص نسلی گروہ سے بلوچوں کا نسلی تعلق بیان کرتے ہیں دوئم یہ تمام آراء غیر سائنسی اور غیر تحقیقی طریقہ کار کے مطابق ہیں جو صرف بلوچوں کا ایک سرسری جائزہ لیکر بیان کیا گیا ہے کبھی تاریخ کے نہ تو قدیم اوراق پلٹ کر دیکھنے کی زحمت کی گئی اور نہ ہی ان کا تاریخ سے قبل کی تہذیب کے ساتھ تعلق کے امکانات دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اگر ان کا ماضی بیان کیا گیا تو صرف چند لوکل اشعار یا زبانی روایات کو مدنظر رکھ کر ان کا جائزہ لیا گیا اور کہیں اگر ماضی کے الفاظ کی روشنی میں ان کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی تو ماضی میں ادا کئے گئے الفاظ کا مفہوم غلط سمجھا گیا اس طرح ہر مورخ نے انھیں مختلف نسلی گروہوں سے منسلک کیا۔

ان اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ بلوچوں کے اپنے مؤرخین سے قبل ان کے نسلی ماخذ پر غیر ملکیوں اور غیر بلوچوں نے رائے زنی کی ہے جسے کسی بھی طرح سے معتبر اور درست قرار نہیں دیا جا سکتا اور جب بلوچ مؤرخین نے اپنی

تحقیق شروع کی تو انھوں نے سند کے طور پر غیر ملکی اور خاص کر برطانوی مواد کو سامنے رکھ کر اپنی تاریخ رقم کی ہے۔ اب یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ برطانیہ نے کبھی بھی ایشیائی اقوام کے ساتھ نیک سلوک نہیں کیا۔ اس نے اپنے مفتوحین کی ایسی تاریخ رقم کی جس نے ان کو مستقبل میں ایک لا حاصل بحث میں مبتلا کر کے اختلافات کا شکار بنا دیا۔

بلوچوں کی تاریخ کو صرف برطانیہ نے ہی نہیں بگاڑا بلکہ یہ تو ہر فاتح کا وطیرہ رہا ہے اس نے جب بھی کسی مفتوح قوم کی تاریخ لکھی ہے تو اس میں مفتوح کا خون بطور روشنائی اور اپنی تلوار کی نوک بطور قلم استعمال کرتے ہوئے الفاظ رقم کی ہے ایسی تواریخ میں مفتوح کے خیالات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور وہ جس طرح چاہے مفتوح کی تاریخ کو مسخ کرسکتا ہے اس پر کوئی روک ٹوک لاگو نہیں ہوتا۔ عرب، ایرانی اور برطانوی وغیرہ چونکہ فاتحین تھے اور انھوں نے بلوچوں کی سرزمین کو بزور شمشیر فتح کرلیا تھا اور چونکہ بلوچوں نے ان فاتحین کے خلاف لمبی اور زبردست مزاحمت بھی کی تھی اس سے فاتحین نے ان پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد انھیں ڈاکو، جنگلی، لٹیرا، غیر مہذب، وحشی اور نجانے کتنے القاب وخطابات دے ڈالے یہ فاتح اقوام کی خاصیت رہی ہے کہ وہ اپنے مفتوح کو کبھی بھی قابل رحم نہیں سمجھتا اور اسطرح مفتوح کی جو بھی تاریخ رقم ہوتی ہے اس میں مفتوح کی رائے کا فقدان ہوتا ہے اور فاتح کی رائے ہمیشہ مقدم رکھی جاتی ہے۔

بلوچوں کی نسلی اور سیاسی تاریخ پر جتنی بھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں ان میں بلوچوں کی نسلی اصلیت کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا گیا ہے اور ان کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ نہ صرف مضحکہ خیز اور حقائق سے ہٹ کر ہے بلکہ ان میں بلوچوں کی اصل تاریخ کو مزید الجھا دیا گیا۔'' (31)

دراصل ان بہروپیوں کا اصل مقصد فوجی نقطہ نظر سے خطے کا جائزہ لینا تھا۔ ان مقاصد میں ذرائع نقل وحرکت اور حکمرانوں کی افرادی قوت شامل تھی مگر ان ایجنٹوں نے اپنے روزمرہ کے مشاہدات، واقعات، حالات دید وشنید کومن وعن تحریر کیا جن کی وجہ سے ان کی تحریروں میں اغلاط کی کثرت ہے۔ انہوں نے صفحہ بہ صفحہ بلوچ قبائل کو وحشی لٹیرے، ڈاکو، قاتل اور غیر مہذب تحریر کیا، حالانکہ قدم بہ قدم ان وحشی، لٹیرے، ڈاکو، قاتل اور غیر مہذب قبائل نے نہ صرف ان کی مہمان نوازی کی بلکہ انہیں رہنمائی بھی فراہم کرتے رہے۔ وگرنہ ان بہروپیوں کا بلوچستان کے وسیع میدانوں، پرپیچ کوہساروں اور صحرائی بھول بھلیوں سے زندہ نکلنا ناممکن تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو خدا کا فرستادہ اور اپنے میزبانوں اور راہبروں کو وحشی درندہ لکھتے ہیں۔ اب اس سے زیادہ بددیانتی اور خودغرضی کیا ہوسکتی ہے اور کیسے ان برطانوی تحریروں پر بھروسہ کیا جاسکتا اور کیسے انہیں حتمی کہا جاسکتا ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ آج سے دوسوسال قبل جب یہاں ذرائع مواصلات بالکل کہنہ وشکستہ تھے مہم جوئی وسیاحت کرنا بہت دل گردے کا کام تھا۔ قدم قدم پر پوٹینگر اور اس کے ساتھی کیپٹن کرسٹی کو لٹنے اور مرنے کا اندیشہ تھا لیکن انہوں نے جس دلیری، جرأت، حاضر دماغی، موقع شناسی، خطر پسندی اور قوت برداشت کا ثبوت دیا وہ یقینا قابل تحسین تھا اور ان کا یہی جذبہ ان کی قوم ووطن کے لئے مفید ومعاون ثابت ہوا۔ گویا کہ ان کا جذبہ انسانی ہمدردی، خوشحالی احترام اور تحصیل علم کا تو نہ تھا تاہم انگریز جب ہوس پرستی کے شیطانی چرخے پر سوار تھے تو اس کے افراد ذمہ داری، مستقل مزاجی اور فرض شناسی کا ایک روشن اور مثالی نمونہ ضرور تھے اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس توسیع میں اپنا حصہ ڈالنا اپنا فرض سمجھتا تھا یہی تو وجہ تھی کہ تاج برطانیہ کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔

لیفٹیننٹ گرانٹ کی تحریریں دستیاب نہیں ہیں البتہ کرسٹی کی تحریروں کے بعض حصے لیفٹیننٹ ہنری پوٹینگر کی کتاب سفرنامہ سندھ وبلوچستان میں ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی برطانوی مواد کثرت سے دستیاب ہے کہ جو بلوچستان کے بارے میں انیسویں صدی کے دوران تحریر ہوتے رہے ہیں۔ کیونکہ پوٹینگر کے بعد بلوچستان میں برطانوی مداخلت بڑھتی گئی اوران کی آمد میں بھی تیزی آتی گئی انہیں بہرحال افغانستان پر قبضہ کرنا تھا اوراپنی سرحدیں روس کے ساتھ منسلک کرنی تھیں اوراپنے سامراجی اورتوسیع پسندانہ خواہش کی تکمیل کے لئے وہ سب کچھ کرنا چاہتے تھے۔ برطانیہ کو خطے کے دیگر ممالک اوران میں بسنے والے انسانوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی اور نہ ہی طاقت کے نشے میں چور برطانیہ انسانیت کے احترام سے واقف تھا وہ وحشی اور درندے تھے اور انسانوں کا شکار کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ لہٰذا افغانستان اور ہندوستان کے مابین آنے والی تمام ریاستوں کوانہوں نے آہستہ آہستہ ہڑپ کرنا شروع کیا۔

1838ء میں سرالیگزنڈر برنس نے خان قلات میر محراب خان شہید سے ایک معاہدہ کیا اور برطانوی افواج نے اسی سال شاہ شجاع کی نام نہاد امداد کے بہانے افغانستان پرحملہ کردیا۔ مگر بلوچستان سے گزرنے والی برطانوی کانوائیوں پر بلوچ (مری) قبائل کے حملوں نے افغانستان پر حملہ آور برطانوی فوج کے قدم اکھیڑ دیئے اور اسے سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا لہٰذا برطانیہ نے سب سے پہلے قلات کوہضم کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1839ء میں انڈس آرمی نے جنرل ولشائر کی کمان میں قلات پرحملہ کیا اور خان قلات میر محراب خان اپنے سینکڑوں ساتھیوں سمیت انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔

سقوط قلات کے بعد بلوچستان میں برطانوی اہلکاروں اور جاسوسوں کی آمد ورفت بڑھ گئی اور انہوں نے اس سارے خطے میں اپنا نیٹ ورک پھیلایا اور اسے روز بروز وسعت دیتے رہے۔ قلات کے سقوط سے قبل آنے والے جاسوس بہروپ بدل بدل کر اس خطے کی سیاحت کرتے رہے ۔ مگر بعد از سقوط قلات یہ لوگ بلوچستان بھر میں دندناتے پھرنے لگے اور زیادہ سے زیادہ معلوم داری حاصل کرنے لگے ۔ ان ہی برطانوی جاسوسوں میں ایچ ۔ جی ریورٹی بھی قابل ذکر ہے کہ جس نے افغان اور بلوچ سرزمین کی جامع سیاحت کی اور برسوں کے سفرنامے اور تجربات کو بالآخر ایک کتاب کی شکل میں شائع کروایا ۔ اس ضخیم کتاب کا عنوان Notes On Afghanistan and Balochistan ہے، جسے نساء ٹریڈرز کوئٹہ نے شائع کیا بعد ازاں اس کا اردو ترجمہ ''سرزمین افغان وبلوچ'' کے نام سے پروفیسر سعید احمد رفیق نے کیا اور گوشہ ادب نے اسے کوئٹہ سے چھپوا کر شائع کیا۔ مسٹر ریورٹی کو بھی پیش روؤں کی طرح فوجی نقل وحرکت اور ذرائع آمدورفت کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کی غرض سے ان خطوں کی جانب بھیجا گیا تھا وہ بھی بنیادی طور پر ایک فوجی تھا اور علم تاریخ سے اس کا دور تک کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر پوٹینگر کی طرح ان کی تحریر بھی بے شمار اغلاط کے باوجود بلوچستان کے بارے میں معلومات کا ایک بہترین ذریعہ ہے ۔ برطانوی مصنفین اکثر ناموں کے لکھنے میں احتیاط نہیں برتتے اور ان کو اپنے لب ولہجے میں بیان کرتے ہیں ۔ ریورٹی نے بھی قندھار کے قدیم نام کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے ۔ قندھار جسے عرب مورخین یا دیگر فارسی اردو اور عربی ذرائع بالش، بیلوش یا بیلوس لکھتے ہیں۔(32) ریورٹی اسے بالیوس تحریر کرتا ہے (33) جو یقینا بیلوس کی بگڑی ہوئی شکل ہے جیسا کہ پوٹینگر نے مستونگ کے قصبے پڑنگ آباد کو پڑنگو وڈ تحریر کیا ہے (34) جو یقینا برطانوی

انگریزی تلفظ ہے یا جیسا کہ قدیم لفظ اربوئی (35) کو بگاڑ کر براہوئی بنادیا اور لفظ اربوئی کو قلات کے ایک مخصوص پہاڑی تفریح گاہ تک محدود کیا گیا۔ حالانکہ یہ لفظ اربوئی (جسے پوٹینگر فارسی کے ہربوئی یعنی ہر قسم کی خوشبو سے تشبہیہ دیتا ہے) سکندر اعظم کے ہندوستان سے براستہ مکران وبیلہ ایران کی جانب واپسی کے سفر کے دوران یونانی تحریروں میں ملتا ہے جو نہ صرف یہ لفظ جھلاوان میں آباد قبائل کے لئے استعمال کرتے ہیں بلکہ ان قبائل کے پہاڑی مساکن حتیٰ کہ دریا کا بھی بعینہ یہی نام تحریر کرتے ہیں۔(36) ممکن ہے پوٹینگر نے یونانی ٹیکسٹ کا مطالعہ نہ کیا ہو اور مقامی سطح پر لوگوں سے لفظ ہربوئی سن کر تحریر کیا ہو یا پھر ممکن ہے کہ پوٹینگر نے یہ سب کچھ ایک سامراجی سکیم کے تحت کیا ہوتا کہ زبان کے اختلاف کو بہانہ بنا کر بلوچ قومی یکجہتی کو پارہ پارہ کر سکے ۔ بہرحال پوٹینگر کی تحریر میں اغلاط کی کثرت ہے اور اس کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر عیاں ہوتی ہے کہ یہ کتاب سامراج کے عزائم اور مفادات کو مدنظر رکھ کر تحریر کی گئی ہے ۔ جبکہ ریورٹی کی کتاب بھی تاریخی اغلاط سے خالی نہیں ہے اور اس میں بعض تاریخی اور اہم ترین واقعات کو ضبط تحریر میں نہیں لایا گیا ہے اور بلوچستان کے بارے میں بعض واقعات کے بیان میں غلطی کی گئی ہے۔ مثلاً قلات وقندھار کے مابین طے پانے والا مشہور زمانہ عہدنامہ قلات یا عہدنامہ عدم مداخلت 1758ء (37) کا تذکرہ شرائط اور تبصرہ وتنقید سے ریورٹی نے اجتناب کیا ہے کیونکہ برطانوی مفادات افغانستان کے ساتھ وابستہ تھے اور وہ کوئی ایسی بات بیان نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جس سے افغانستان کے اٹھارہویں صدی کی حقیقی پوزیشن بحوالہ بلوچستان واضح ہوجائے لہٰذا اس نے اس معاہدہ کا تذکرہ نہیں کیا کیونکہ یہ معاہدہ افغانستان کے بعض دعوؤں کی جھوٹی قلعی کھولتا تھا اور بلوچستان کی کامل آزادی کی تصدیق کرتا تھا۔ ریورٹی

کے اس احتیاطی رویے نے بلوچستان وافغانستان کی اٹھارہویں صدی کی سیاست میں ایک خلا پیدا کیا جبکہ میلسن جس نے افغانستان کی تاریخ رقم کی وہ اپنی کتاب میں اس عہدنامے کا تفصیلی تذکرہ کرتا ہے۔(38)اگر میلسن کی تحریر میں یہ معاہدہ مذکور نہ ہوتا تو یقینا تمام تر برطانوی مواد بلوچستان کے حوالے سے بیکار ہوتا۔ کیونکہ جغرافیہ یا نسلی وقومی تاریخ وثقافت ایسی چیزیں ہیں کہ جو ظاہراً موجود ہوتی ہیں نہ تو جغرافیہ کو چھپایا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی کی نسلی وقومی تاریخ وثقافت کو درپردہ رکھا جاسکتا ہے البتہ سیاسی تاریخ ایسی چیز ہے کہ جسے ضابطہ تحریر میں حقائق کے عین مطابق اور حوالہ جاتی طور پر بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس میں ردوبدل کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں جانبداری کو ہمیشہ مرکوزنظر رکھا جاتا ہے زیادہ تر برطانوی مورخین نے اپنے افغانستان سے منسلک ووابستہ مفادات کی خاطر بلوچستان کی نسلی وقومی ، جغرافیائی اور سیاسی تاریخ میں جان بوجھ کر اغلاط کیں اور ہمیشہ جانبداری کا مظاہرہ کیا یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر مورخین بلوچستان کو افغانستان کا ایک ذیلی حصہ تحریر کرنے کی غلطی کرتے ہیں اور یا تو بعض تاریخی حقائق کو ماننے سے منکر ہوتے ہیں یا پھر ان کو مسخ کرکے پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر راؤلنسن نے کیا کہ اندھا دھند بلوچ قوم کوکلدانی تحریر کیا یعنی سامی النسل کلدانی (39)اورشاہ بابل نمرود (بعض مذہبی کتابوں اورتاریخی ذرائع کے مطابق یہ دراصل حامی النسل تھا) (40) کی اولاد لکھا اور بیلوس کو اس کا لقب اور بعل دیوتا اور بابل سے تشبیہہ دی۔ (41)شاید پروفیسر راؤلنسن یہ نہیں جانتا تھا کہ تاریخ میں جتنے بھی نمرود گزرے ہیں طبقات ابن سعد جیسے مستند تاریخی مسودے کے مطابق سب کے سب حامی النسل تھے (42)اورتاریخی ذرائع اس بارے میں کوئی بھی رائے دینے سے معذور ہیں کہ آیا کبھی بابل کے کلدانی جوعظیم شہروں کے وارث اور زرخیز

زمینوں کے مالک تھے کیا انہوں نے تاریخ کے کسی زمانے میں بلوچستان کی جانب مہاجرت کی ہے؟ بلوچستان کی قدیم تہذیبی آثار میں کلدانیوں کے آنے اور یہاں آباد ہونے یا اپنی تہذیب وثقافت اور مذہبی اعتقاد کو پھیلانے کی کوئی نشانی نہیں ملتی ۔مگر چونکہ پروفیسر راؤلنسن بھی اس سامراجی ادارے کا ایک فرد تھا لہٰذا بحیثیت فاتح انہوں نے جو لکھا اس میں مفتوح کے خیالات کی ترجمانی کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ بعد ازاں بلوچ تاریخ پر لکھنے والے بعض مقامی مشہور مورخین (43) نے اندھا دھند پروفیسر راؤلنسن کی تقلید شروع کی باقی برطانوی مورخین و مصنفین کہ جو اصل میں فوجی یا سیاسی سرکاری ملازمین ہوتے تھے کی کتابوں میں موجود اغلاط کی طرح راؤلنسن کی تحریر بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔

بلوچستان میں جاسوسی دور کے اختتام پر یہاں باقاعدہ برطانوی نمائندوں کی تعیناتیاں ہونے لگیں اور یہ سلسلہ بالآخر تقسیم ہند آزادی بلوچستان اور قیام پاکستان تک چلتا رہا۔ اس دوران ان سرکاری نمائندوں نے کہ جن کا تذکرہ ہوا کہ وہ یا تو فوجی یا سول افسر ہوتے تھے بلوچستان ، افغانستان ، ایران اور گردونواح کے بارے میں تصینفات رقم کیں اور کافی حد تک ان خطوں کے بارے میں مواد فراہم کیا مگر درست حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تمام تر مواد سامراجی مقاصد کے لئے تحریر کئے گئے جن کے پڑھنے سے برطانوی عزائم کھل کر سامنے آتے ہیں ۔لہٰذا ان تحریروں میں سے اکثر ناقابل بھروسہ ہیں اور بعض تحریروں کے کچھ حصے یا بعض بیانات حقائق سے ہٹ کر ہیں اور یہی غیر حقیقی اور غیر حقیقت پسندانہ طرز بیان انہیں استناد سے محروم کرتا ہے۔

بلوچستان میں برطانوی اثر ونفوذ کے بعد کئی برطانوی افسران اس خطے میں آئے اور اپنی اپنی نوکریوں کے چند سال یہاں گزارے لہٰذا ان میں سے بعض نے تصینفات رقم کیں اور کچھ نمائندوں کے بارے میں دیگر اہل قلم نے تحریر کیا۔ ایڈورڈ۔ ای آلیور بھی انہی افسران میں سے تھا کہ جو بلوچ اور پشتون خطوں میں اپنے سرکار کے حکم سے خدمات بجالا رہا تھا اس نے بھی مورخ نہ ہوتے ہوئے بننے کی کوشش کی اور بلوچ و پشتون قبائل کی نسلی تاریخ پر طبع آزمائی شروع کی اور پیش روؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تقسیم کرو کی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ اس نے ان اقوام وقبائل کی تاریخ کو نئی سمت میں لے جانے کی کوشش کی اور اسے زیادہ سے زیادہ گنجلک بنانے کی سعی کی (44) اے ڈبلیو ہیوز بھی ان برطانوی جاسوس نما افسروں میں سے تھا کہ جنہوں نے بلوچستان میں برطانوی سامراج کی خدمت کے لئے کافی عرصہ گزارا اور یہاں کے بارے میں سیاسی ، جغرافیائی، نسلی ، عسکری اور معاشرتی معلومات برطانوی حکومت کو فراہم کرتا رہا۔ انہوں نے بلوچستان کے مختلف حصوں کی سیاحت کی اور مختلف راستوں کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے مکران کی سیاحت کی اور اس کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کیں (45) انہوں نے درہ مولہ کے مشکل سفر کو بھی منزل بہ منزل عبور کیا اور ہر منزل کی کہانی ورو داد لکھی اور درہ مولہ کے لاتعداد عجائبات کا تذکرہ بھی کیا (46) علاوہ ازیں انہوں نے لسبیلہ وسراوان وایرانی وافغانی بلوچستان کے بارے میں بھی بے تحاشا معلومات فراہم کیں باقی برطانوی تحریروں کی نسبت اے ڈبلیو ہیوز کی کتاب The Country of Balochistan زیادہ جامع معلومات فراہم کرتی ہے اس کا اردو ترجمہ پرفیسر ایم انور رومان نے سرزمین بلوچستان کے نام سے کیا ہے اور نساء ٹریڈرز کوئٹہ نے اسے شائع کیا ہے (47) مگر اس خطے کے بارے میں تحریر شدہ یہ مواد بھی اغلاط سے

مبرا نہیں ہے اور بعض تاریخی نوعیت کے واقعات اس میں شامل نہیں کئے گئے یا پھر ان کا بھی باقی برطانوی مورخین کی طرح عمداً تذکرہ نہیں کیا گیا، جیسا کہ بلوچستان کا رقبہ لکھتے وقت وہ احتیاط سے کام نہیں لیتا اور ایرانی، افغانی اور قلاتی حصوں کو ملا کر ان کا کل رقبہ 1,40,000 ایک لاکھ چالیس ہزار مربع میل رقم کرتا ہے جو کہ سراسر غلط ہے۔اس طرح کے کئی بنیادی غلطیاں ان کی کتاب میں بھی ملتی ہیں بہرحال علاقہ جاتی طور پر انہوں نے کافی حد تک بلوچستان کی اہم گذر گاہوں کا بہترین تذکرہ کیا ہے اوران کی تحریروں سے ہی ان کے فوجی ہونے اورفوجی مقاصد کے لیے کام کرنے کی نمائندگی ہوتی ہے۔

لانگ ورتھ ڈیمز نے بلوچستان اور بلوچ قوم وبلوچی زبان وادب پر بے تحاشا کام کیا اور انہیں مسلسل شائع کروانے کے ساتھ کتابی شکل بھی دی،ان کی مشہور کتابوں میں بلوچ ریس Baloch Race اور Popular Poetry of Baloches قابل ذکر وقابل ستائش ہیں جن سے بلوچی زبان وادب اور نسلی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف بلوچ نسلی تاریخ پر رائے دی اور کام کیا بلکہ شاہنامہ فردوسی کے کوچ وبلوچ اور رندولاشارعہد کی بلوچی شاعری کو بھی اپنا موضوع بنایا۔رندولاشارعہد کی بلوچی شاعری جو کہ صدیوں سے زبانی کلامی چلی آرہی تھی اور بلوچوں نے کبھی بھی اسے یکجا کرکے کتابی شکل دینے کی زحمت گوارانہیں کی تھی۔ڈیمز نے کوشش بسیار کے بعد اس دور کی شاعری کا ایک بڑا حصہ جمع کیا اور انہیں انگریزی میں ترجمہ،شرح وبسط کے ساتھ 1907ء میں شائع کیا۔بعد ازاں ان کی اس مشہور کتاب کو بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے پاپولر پوئیٹری آف بلوچز کے نام سے شائع کیا(48) تو ڈیمز کے بعد اس موضوع پر لاتعداد بلوچ اہل علم وقلم اور

دانش وروں نے بھی قلم آزمائی کی اور رندولاشار عہد کی شاعری کے ایک بڑے حصے کو ضبط تحریر میں لا کر اس اہم خزانے کو ہمیشہ کے لئے محفوظ ومامون کردیا۔ ان دانش وروں میں شیر محمد مری کی بلوچی کہنیں شاعری (49) جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری کی بلوچی کہنیں شاعری (50) اور کئی دیگر اہل قلم شامل ہیں۔

البتہ ڈیمز بھی برطانوی پالیسی سازوں سے نہ بچ سکا اور انہوں نے بھی نسلی اور قومی تاریخ کو اور زیادہ گنجلک اور پیچیدہ بنا دیا۔ انہوں نے فردوسی کے شاعری کے ردیف کو زیر بحث لا کر بلوچ قبائل کو کوچ وبلوچ میں تقسیم کردیا۔ حالانکہ اولاً تو فردوسی نے شاعری کے اوزان کو برابر کرنے اور کچھ تشبیہات کی خاطر لفظ کوچ کو بلوچ کے ہم وزن اور ہم پلہ بیان کیا ہے اور دوئم یہ کہ کوچ وبلوچ کے الفاظ ایک ہی نسلی گروہ کے لیے استعمال کیا ہے کیونکہ بقول شاہنامہ وہ ایک ہی امیر کے تحت جنگوں میں حصہ لیتے تھے، جسے ڈیمز نے ایک الگ قوم یا قبیلہ بیان کیا مگر وہ یہ بھول گیا کہ چند صدیوں میں یہ عظیم قبیلہ کوچ یک دم ویکسر تاریخ کے صفحات اور اپنے مسکن سے کہاں غائب ہوا جبکہ اس کی ہم پلہ وہم وزن قوم بلوچ زیادہ بڑے کردار کے ساتھ آج بھی تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔ فردوسی کے ان اشعار میں سے چند ایک درج ذیل ہیں کہ جنکو بنیاد بنا کر ڈیمز نے بلوچ قوم کو تقسیم کرنے کی کوشش کی:

سپاہی زگردان کوچ و بلوچ
سگالیدہ جنگند مانند قوچ (51)

علاوہ ازیں فردوسی اپنے مصرعوں کا وزن برابر کرنے کی خاطر ردیف کے طور پر کوچ وبلوچ کو یکساں تحریر کرتا ہے اور پھر ان کا کوئی ہموزن لفظ دوسرے مصرعے میں استعمال کرتا ہے اور کوچ سے مراد کوئی مخصوص گروہ نہیں لیتا بلکہ ایک تو

مصرعے کا وزن یکساں رکھنے کی خاطر اس لفظ کو استعمال کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ یہ لفظ بلا تفریق ان تمام قبائل کے لئے استعمال کرتا ہے کہ جنھیں وہ وحشی، صحرانورد، پہاڑی وغیرہ سمجھتا ہے اور انہیں ایرانی تہذیب کے مقابلے میں غیر مہذب اور بادیہ نشین تحریر کرتا ہے ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ

نشتند درآں دشت بسیار کوچ
زاوغان ولا چین وکرد وبلوچ (52)

اس شعر میں یہ صاف عیاں ہے کہ وہ ایرانی ہمسایوں یا ایرانی مقبوضات میں رہنے والے تمام قبائل بشمول افغان، تورانی لاچین (دہوار) کرد اور بلوچ وغیرہ کو بلا تفریق اور بلا امتیاز کوچ یعنی وحشی اور غیر مہذب قرار دیتا ہے۔

پوٹینگر اور ڈیمز اور اس طبقہ فکر کے دوسرے دانش ور بعینہٖ ایرانیوں کے اس قدیم نظریے کے پیروکار نظر آتے ہیں جس طرح ایرانی ان قبائل کو تقسیم کرتے اور ان پر حکومت کرتے نظر آتے ہیں بالکل اسی طرح برطانوی نوآبادیات قائم کرنے والوں نے جہاں جہاں اپنے پر پھیلائے وہاں انہوں نے مقامی آبادی کو نسلی اور قومی تقسیم میں مبتلا کر کے آپس میں لڑایا اور خود ان کے مابین ثالث بن کر ان پر حکمرانی کرتے رہے۔ برطانوی قابضین نے بلوچستان میں یہی عمل شد و مد کے ساتھ دھرایا۔ پہلے انہیں براہوئی اور بلوچ میں تقسیم کرنے کی مذموم کوشش کی اور بعد ازاں آپس میں سالوں تک بلوچ قبائل اور ان کے حکمران کو خانہ جنگی کی بھڑکتی ہوئی بھٹی میں ڈالا تا آنکہ 1876ء میں معاہدہ مستونگ (53) کے ذریعے برطانیہ نے ثالث بن کر ان کا یعنی بلوچ قبائل اور خان بلوچ کا آپس میں تصفیہ کروایا۔ 13 جولائی 1876ء کے اس دن کے بارے میں ایک فاضل مورخ لکھتا ہے کہ،

”یہی وہ منحوس دن تھا کہ جب خدائیداد خان کا تاج سنڈیمن کے قدموں میں تھا اور بلوچستان اس کی مٹھی میں تھا۔“(54)

دنیا کے بیشتر مقبوضات میں برطانیہ نے یہی پالیسی اپنائی جہاں اس کے سامنے شدید مزاحمت ہوئی اور اسے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہوا تو اس نے معاہدات، سازشوں اور عیاری و مکاری سے کام لیا اور جہاں طاقت کی ضرورت پڑی تو اس نے اس کا بے دریغ استعمال کیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب بڑی طاقتیں کسی قوم و ملک کو غلام بناتی ہیں تو سب سے پہلا وار ان کی تاریخ و تہذیب پر کرتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کی پہلی انٹری کے ساتھ ہی تاریخ سے نابلد لوگ یہاں کی تاریخ اور ثقافتی وسماجی اداروں پر لکھنے لگے۔

انگریزوں کی سازش اور بلوچ تاریخ و تہذیب پر حملے کی ایک مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ کئی برطانوی فوجی وسول افسروں اور دانشوروں نے بلوچ قوم کی تاریخ پر بڑی تصنیفات رقم کیں اور ہر ایک نے بلوچ نسلی تعلق کو بیان کیا مگر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ یہ کثیر تعداد میں موجود دانش ور بلوچ نسلی یا قومی تعلق کے بارے میں کسی ایک نقطے پر متحد اور متفق نہیں ہیں بلکہ ہر ایک نے دوسرے سے بالکل مختلف رائے دی اور مختلف نسلی گروہوں کے ساتھ بلوچوں کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔اس بارے میں ان کی رائے زنی سے کئی نتائج نکلتے ہیں اول یہ کہ ان کی سامراجی سوچ اور فکر یعنی چھوٹی قوموں کو غلام بنانے کے لئے ان پر قبضہ کرنا لہٰذا ان کی تاریخ مسخ کردینا، ان غلام قوموں کو اپنی پستی کا احساس دلا کر انہیں کمتر درجے پر رکھنا، انہیں ان کی تاریخ سے بیگانہ کرکے تاریخ کے گنجلک اور پیچیدہ مسائل سے دوچار کرنا ،انہیں سماجی طور پر پست درجہ رکھنا، ان کی توجہ اصل مسائل یعنی بیرونی

قبضہ واختیار کے خلاف جدوجہد سے ہٹانا وغیرہ ۔ یہی وہ ہتھیار ہے کہ جس کے ذریعے نہ صرف برطانیہ بلکہ ہر غالب قوت نے دیگر قوموں پر قبضہ واختیار حاصل کیا۔

جی ۔ پی ٹیٹ بھی ان افسروں میں سے تھا کہ جس نے اپنی سرکاری ملازمت کا بیشتر حصہ بلوچستان اور افغانستان میں گزارا اور ان ممالک کی سیر وسیاحت کی اس نے بھی ڈیمز کی طرح کافی زیادہ تحریری مواد فراہم کیا ہے ۔ اس کی مشہور تصنیفات میں The Frontiers of Balochistan, The Kingdom of Afghanistan اور Siestan شامل ہیں ۔وہ بھی اپنے دیگر مقلدین اور ہم پیشہ افراد کی طرح بلوچستان اور افغانستان کے موضوعات پر طبع آزمائی کرتا ہے اورانہوں نے برطانوی سامراجی مفادات کو مدنظر رکھ کر ان خطوں اور ان میں بود وباش رکھنے والوں کی تاریخ ، سیاست اور جغرافیہ پر ضخیم کتابیں تحریر کیں ۔ ٹیٹ کی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ برطانیہ کا ہر مصنف جانبدارانہ طریقے سے اور صرف اپنے مفادات کو عزیز سمجھتا ہے۔ انہیں حقیقی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ۔ وہ وہی کچھ تحریر کرتا ہے جو اس کے نزدیک بہتر ہے وگرنہ اکثر وبیشتر حقیقی بیانات اور تاریخی حقائق سے وہ چشم پوشی یا روگردانی کرتا ہے۔

سر رابرٹ گروز سنڈیمن کے نام سے علم تاریخ خصوصاً بلوچستان کی تاریخ سے شغف رکھنے والا ہر شخص واقف ہے۔یہی وہ شخص تھا کہ جو معاہدہ مستونگ 1876ء میں ثالث بن کر آیا اور بلوچستان کو بغیر کوئی گولی چلائے فتح کرلیا ۔ رابرٹ سنڈیمن کی سوانح حیات تھامس ہنری تھارنٹن نے لکھی ہے ۔ علاوہ ازیں بھی اس کے بارے میں کئی دیگر اہل دانش نے قلم آزمائی کی ہے۔اس برطانوی نمائندہ کی جائے پیدائش سکاٹ لینڈ تھی جہاں وہ 1835ء میں پیدا ہوا(55) پہلے

برطانوی فوج میں خدمات سرانجام دیں اور پہلی جنگ عظیم کے دوران دوبار محاذ پر شدید زخمی ہوا لہذا فوج چھوڑ کر سویلین انتظامی عہدوں پر کام کرنے لگا (56) ڈیرہ غازی خان میں بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر گرانقدر خدمات انجام دیں اور کوہ سلیمان کے سرکش بلوچ قبائل کو انتہائی چالاکی، عیاری اور لالچ کے ذریعے رام کرلیا اور اس پورے علاقے میں مثالی امن قائم کرلیا۔ اس کے رفاہی اور فلاحی کاموں کی وجہ سے کوہ سلیمان کے بلوچ سردار اور قبائل اس کے دلدادہ ہوگئے لہذا 1875ء میں وہ قلات چلا آیا اور خان میر خدائیداد خان سے ملاقات کی (57) مگر خان نے اس کے ساتھ سوائے رسمی بات چیت کے کوئی سرکاری بات نہ کی کیونکہ وہ باقاعدہ برطانوی نمائندہ بن کر نہیں آیا تھا بلکہ اپنی مرضی سے آیا تھا مگر اگلے سال یعنی 1876ء میں وہ بلوچ سرداروں کی معیت میں برطانوی ثالث کی حیثیت سے مستونگ آیا اور ایک دربار منعقد کرکے سرداروں اور خان قلات کے مابین ثالث بن کر تصفیہ کروایا اور 21 سالہ خانہ جنگی کہ جو بذات خود برطانوی ایجنٹوں کی لگائی ہوئی آگ تھی کو بجھانے میں کامیاب ہوا۔ سنڈیمن کی ساری زندگی برطانیہ کی خدمت کرنے میں گزری اور اس شخص نے مختلف معاہدات، معاہدہ مستونگ 1876ء معاہدہ بولان 1876ء معاہدہ کوئٹہ 1883ء (58) وغیرہ کے ذریعے بلوچستان کے اکثر علاقے خان قلات سے ہتھیا لیے اور انہیں برطانوی تحویل میں دے دیا۔ 1885ء میں کوئٹہ کو معاہدہ گنڈا مک 1879ء کے ذریعے زیر قبضہ آنے والے علاقوں میں رکھا اور ڈیورنڈ لائن معاہدہ 1893ء کے بعد کوئٹہ کو برٹش بلوچستان میں شامل کرکے اس کا دارالخلافہ بنا دیا، علاوہ ازیں نوشکی، نصیر آباد اور کئی دیگر علاقوں کو خان قلات سے معاہدات کے ذریعے 99 سالہ لیز پر حاصل کرلیا۔ اس طرح سنڈیمن اپنی چالاکی اور عیاری کے ذریعے بلوچستان کے حصے بخرے کرنے میں کامیاب ہوا۔ برٹش بلوچستان کے

دارالخلافہ کوئٹہ میں سنڈیمن ہائی سکول،سنڈیمن پراونشل ہسپتال،سنڈیمن میوزیم، سنڈیمن لائبریری، سنڈیمن ہال اورلیڈی سنڈیمن گرلز ہائی سکول وغیرہ اسی برطانوی نمائندے کی نشانیاں ہیں ۔ اسی شخص کے بلوچستان میں سروس کے دوران دوسری اینگلو افغان جنگ 1878ءلڑی گئی۔ کوئٹہ اور بولان نے اس جنگ میں مرکزی علاقائی کردار ادا کیا اور یہ سب کچھ رابرٹ سنڈیمن کے اقدامات کی وجہ سے ممکن ہوسکا۔ معاہدہ گنڈا مک 1879ءبھی سنڈیمن کی کوئٹہ میں تعیناتی کے دوران طے پایا تھا۔مختصر یہ کہ ہنری پوٹینگر اوراس کے ساتھی کیپٹن کرسٹی نے جس ملک کی سیاحت کی تھی اور جس خطے کا دروازہ برطانیہ کے لئے کھولا تھا آخر کاراس دروازے کی چابیاں پوٹینگر کی آمد کے 66سال بعد سنڈیمن کے قبضے میں آ گئیں ۔ سنڈیمن نے اپنی باقیماندہ زندگی بلوچستان میں گزاری اورلسبیلہ کے دورے کے دوران وہیں پر بیمار ہوکر 1892ءمیں فوت ہوا(59)اوروصیت کے مطابق انہیں وہیں پر دفنا دیا گیا۔

ایسے ہی برطانوی جاسوسوں میں رچرڈ آئزک بروس بھی شامل ہیں کہ جنہوں نے ایک جاسوس ہی کی حیثیت سے ان خطوں یعنی بلوچستان اورافغانستان کی سیاحت کی تھی۔ ان کے سفر کی پوری روداد اور برطانوی پالیسی ان کی تحریر کردہ کتاب (سفرنامے) سے ہی واضح ہوتی ہے کہ جس کا عنوان ہی اس وضاحت کے لئے کافی ہے۔عنوان ہے Forword Policy and its Results ہےاور بک ورلڈ نے اسے شائع کیا ہے ۔(60) اس کتاب کا ہر صفحہ برطانوی سامراجی عزائم کی عکاسی کرتا ہے۔کمانڈر ٹی۔ جی۔چارلس ایک برطانوی میرین تھا جس نے لسبیلہ کے ساحلوں پر اتر کراندرون ملک کی سیاحت کی تھی ۔ یہی وہ شخص تھا کہ جس نےلسبیلہ میں ماہی پیر کے مقام پر واقع شہر روغان کے قدیم غاروں کی نشاندہی کی تھی(61)اسی

طرح کچھ برطانوی افسروں کو بلوچستان کا ضلعی گزیٹیئر مرتب کرنے کی ذمہ داری دی گئی جن میں میگانگی McCongey کا نام قابل ذکر ہے کہ جس نے نہ صرف بلوچستان میں خدمات انجام دیں بلکہ ضلعی گزیٹئیر کا زیادہ تر حصہ مرتب کیا۔ بلوچستان کے ضلعی گزیٹیئر میں بلوچستان کے تمام علاقوں، اقوام اور تہذیب وثقافت کے بارے میں اہم اور بنیادی معلومات ملتی ہیں۔(62) تاریخ بلوچستان سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ نہایت ضروری ہے مسٹر ایم۔سی میک گریگر بھی صحرانوردی کرنے والے برطانوی فوجیوں میں سے تھا کہ جو اندرون بلوچستان گھومتا پھرتا رہا ان کی کتاب Wonderings in Balochistan جسے انڈس پبلیکشنز کراچی نے چھاپا ہے(63) بلوچستان کے اکثر خفیہ گوشوں کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔

اس لائن میں بے شمار دیگر نام شامل ہیں کہ جن میں سے ہر ایک نے اپنی بساط سے بڑھ کر اپنے ملک کی سامراجی عزائم کی تکمیل کی خاطر جدوجہد کی اور اپنے حکامِ اعلیٰ کو معلومات فراہم کرتا رہا اور ساتھ ساتھ یہ افسران بلوچ قوم کی تاریخ پر بھی طبع آزمائیاں کرکے اس کی الجھنوں میں مزید اضافہ کرتے رہے۔اس ضمن میں برٹن، کرنل موکلر، پرسی مونسورتھ سائیکس، ایڈورڈ ویکنیلیڈ، سرٹی ہولڈچ اور کئی دیگر معروف نام آتے ہیں۔

المختصر یہ کہ برطانوی جاسوسوں اور ایجنٹوں کی ایک لمبی قطار ہے کہ جو بلوچستان کے اٹھارویں اور انیسویں صدی کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔ اس قطار میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے بلوچستان کے حوالے سے کوئی تحریری مواد نہیں چھوڑا مگر ان کے تذکرے دیگر کتب میں ملتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ جن

کے بارے میں دوسرے لوگوں نے تحریر کیا۔ مگر سب سے زیادہ اہمیت کے حامل وہ لوگ سمجھے جاتے ہیں کہ جنہوں نے بلوچستان کے بارے میں ذاتی طور پر رقم کیا اور اپنے چشم دید حالات رقم کئے جن کی تاریخ نویسی میں سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ بلاشبہ ان جاسوسوں اور توسیع پسندانہ عزائم سے مسلح افراد کی بلوچستان کے بارے میں لکھی جانے والی کتابیں اہمیت کی حامل ہیں اور غور وفکر کے کئی دروازے ان کے مطالعے سے کھل جاتی ہیں۔ بیشمار اغلاط کے باوجود ان کتابوں کی بلوچستان کی تاریخ وتہذیب اور جغرافیہ وسیاست کے حوالے سے اہمیت کو کم نہیں کیا جاسکتا۔ مگر ایک بات یہ بھی واضح ہو کہ بسا اوقات ان لوگوں نے تفویض کردہ اختیارات سے تجاوز کیا اور بعض ایسے بے بنیاد شوشے چھوڑے کہ جن کی وجہ سے آنے والے وقتوں میں بلوچستان اور بلوچ قوم شدید متاثر ہوئی اور ان کی قومی تاریخ تاریکی کے دبیز پردوں میں جا کر چُھپ گئی اور اسے کاری ضرب لگی۔ یہ جاسوس جتنا چاہتے بلوچستان کے بارے میں معلومات اکٹھا کرتے اور جس طرح چاہتے یہاں اپنی جاسوسی مہم کو جاری رکھتے گو کہ یہ سب کچھ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی تھی مگر انہیں یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ وہ بلوچ قوم کی قومی یا نسلی تاریخ پر رائے زنی کرتے اور اسے غلط انداز میں بیان کرتے۔ انہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے تھا کہ جب آنے والے وقتوں میں ان کی جانبداری، توسیع پسندی، منافقت، مکاری، عیاری اور تاریخ کے علم سے نابلد ہونے کا راز کھل جائے گا تب اس وقت ان کی کیا حیثیت باقی رہ جائیگی اور علمی وتحقیقی حلقوں میں انھیں کن الفاظ میں یاد کیا جائے گا۔ البتہ یہ انہی جاسوسوں کی کاوشیں تھیں کہ ان کی فوجیں اور سیاست دان بہت جلد بلوچستان پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگئیں۔

حوالہ جات:

1. عنایت اللہ بلوچ، دی پرابلم آف گریٹر بلوچستان، جی ایم بی ایچ، سٹٹ گرٹ، جرمنی، 19،1987
2. کارل مارکس، ہندوستان کا تاریخی خاکہ، تخلیقات، لاہور، 73،2002
3. شاہ محمد مری، بلوچ قوم قدیم عہد سے عصر حاضر تک، تخلیقات، لاہور، 167،2000
4. عنایت اللہ بلوچ، 119
5. ایضاً، 119-20
6. ہیرلڈ لیم، سکندر اعظم، مترجم، غلام رسول مہر، فکشن ہاؤس، لاہور، 2006، سیکنڈ ایڈیشن، 297-306
7. عزیز اللہ عزیز براوی، ماہنامہ اولس، اسلام آباد، مارچ اپریل، 25،1986
8. حمید بلوچ، مکران، سید ہاشمی اکیڈیمی، کراچی، 237،2008
9. لینن، اقوام مشرق کی تحریک آزادی، فکشن ہاؤس، لاہور، 193،2007
10. ہنری پوٹینگر، ٹریول ان سندھ اینڈ بلوچستان، مترجم: پروفیسر ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1983، سیکنڈ ایڈیشن، 20-21
11. ایضاً، 21
12. ایضاً، 140
13. ایضاً، 12
14. ایضاً، 12
15. ایضاً، 22-23

16. ایضاً،28

17. ایضاً،31

18. ایضاً،48,49

19. ایضاً،61,62

20. ایضاً،62,63

21. ایضاً،64

22. ایضاً،100

23. ایضاً،266

24. ایضاً،17

25. بلوچ،فاروق، خان اعظم میر نصیر خان نوری،حکومت، سیاست، کرداراور شخصیت، فکشن ہاؤس،لاہور،2012،219

26. ونسنٹ اے سمتھ، قدیم تاریخ ہند،ترجمہ: مولانا محمد جمیل الرحمان،تخلیقات،لاہور، 122-26, 2001

27. ایضاً،122-26

28. میر گل خان نصیر،تاریخ بلوچستان،قلات پبلشرز، کوئٹہ،2000،2

29. ہنری پوٹینگر،69

30. ایضاً،268

31. بلوچ، فاروق، بلوچ اوران کاوطن،فکشن ہاؤس،لاہور،2012، 14-13

32. جی۔ لی، سٹرینج،جغرافیہ خلافت مشرقی،مترجم: محمد جمیل الرحمان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،1986،501

33. ایچ۔ جی۔ ریورٹی، سرزمین افغان و بلوچ، مترجم: پروفیسر سعید احمد خالد، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1999، 2-801

34. ہنری پوٹینگر، 382

35. ونسنٹ اے سمتھ، 26-122

36. ایضاً، 26-122

37. عنایت اللہ بلوچ، 105

38. ایضاً، 112

39. ایضاً، 39

40. محمد سردار خان بلوچ، ہسٹری آف بلوچ ریس، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1958، 9

41. ایضاً، 9

42. محمد ابن سعد، طبقات ابن سعد، مترجم: علامہ عبداللہ العماری، نفیس اکیڈمی، کراچی، 61

43. بلوچ تاریخ نویسی میں کئی ایسے نامور شخصیات شامل ہیں کہ جنہوں نے من وعن یا تشبیہاتی حد تک پروفیسر راؤلنسن سے اتفاق کیا ہے۔ مثلاً محمد سردار خان، میر گل خان نصیر، میر احمد یار خان، مولانا نور احمد فریدی، پروفیسر عزیز محمد بگٹی وغیرہ۔

44. ایڈ ورڈ ای۔ آلیور، اے کراس دی بارڈر، یا پٹھان اور بلوچ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2000، 26-18

45. اے ڈبلیو ہیوز، دی کنٹری آف بلوچستان، سیلز اینڈ سروسز، کوئٹہ، 2002، 71-151

46. ایضاً، 99-96

47. اے ڈبلیو ہیوز، سرزمین بلوچستان، مترجم، ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 2011، سیکنڈ ایڈیشن، 36-202 , 38-134

48. لانگ ورتھ ڈیمز، پاپولر پوئٹری آف بلوچیز، بلوچی اکیڈیمی، کوئٹہ، 1988، سیکنڈ ایڈیشن

49. شیر محمد مری، بلوچی کہنیں شاعری، بلوچ اکیڈیمی، کوئٹہ،1970

50. جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری، بلوچی کہنیں شاعری، بلوچی اکیڈیمی، کوئٹہ،1974

51. میر گل خان نصیر، کوچ و بلوچ، سیلز اینڈ سروسز، کوئٹہ،1999، 31

52. ایضاً،24

53. محمد سعید دہوار، تاریخ بلوچستان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ،1990، 690

54. میر گل خان نصیر،2000، 282

55. ہنری تھارنٹن، کرنل سر رابرٹ سنڈیمن، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1977، 16

56. ایضاً، 11-5

57. میر گل خان نصیر،2000، 269

58. میر احمد یار خان، تاریخ قوم بلوچ و خوانین بلوچ، العصر پبلی کیشنز، لاہور، 2007، 127

59. ہنری تھارنٹن، 67-266

60. رچرڈ آئزک بروس، فارورڈ پالیسی اینڈ اٹس رزلٹس، بک ورلڈ، کوئٹہ، 2002۔

61. گورنمنٹ ریکارڈ، بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹئیر (لسبیلہ)، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1997

62. گورنمنٹ ریکارڈ، بلوچستان تھرو دی ایجیز، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ

63. میگ گریگر، ونڈرنگز ان بلوچستان، انڈس پبلیکیشنز، کراچی، 2003، سیکنڈ ایڈیشن

باب چہارم

برطانوی جاسوسوں کی آمد کے اثرات

جس طرح کہ ایک ازلی فطری قانون ہے کہ ہر شے کے دو رُخ ہوتے ہیں ایک تاریک اور دوسرا روشن یا ایک منفی دوسرا مثبت۔ بلوچستان میں برطانوی جاسوسوں اور سرکاری ایجنٹوں کی آمد کے بھی بلوچستان پر ہر دو طرح کے اثرات مرتب ہوئے۔ گو کہ بلوچستان میں برطانیہ کی آمد اور قبضہ سو سالہ غلامی پر محیط ہے اور اس دور کو بہر حال غلامی کا دور ہی کہا جائے گا اور جو ایک بدترین زندگی ہوتی ہے۔ مگر ایسا نہیں کہ غلامی کو بدترین سمجھ کر بھی اس کے خلاف جدوجہد نہ کی جائے بلکہ ضروری ہے کہ جب لفظ غلامی کا مفہوم وسیع معنوں میں سمجھ میں آجائے تو اس کے خلاف ہر سطح پر جدوجہد کرنی چاہیے۔ جیسا کہ برطانوی قبضے کے خلاف بلوچ قبائل نے نوے سالوں تک ایک طویل جنگ لڑی اور بالآخر اسے یہاں سے نکلنے اور اپنا قبضہ ختم کرنے پر مجبور کر دیا مگر تب تک برطانیہ کے قبضے کے گہرے اثرات اس خطے اور اس کے باشندوں پر پڑ چکے تھے۔ برطانوی جاسوسوں کی آمد اور بعد ازاں برطانوی قبضے اور ایجنٹوں کی تعیناتی کے دوران ان آلہ کاروں نے جو اقدامات کئے انہوں نے بلوچستان اور بلوچ قوم کے سیاسی، قومی، نسلی، قبائلی، ادبی اور جغرافیائی ماحول کو شدید متاثر کیا، گو کہ ان میں سے بعض اثرات کے مثبت نتائج نکلے مگر مجموعی طور پر بلوچستان کو ہر سطح پر شدید نقصان پہنچا۔

انگریزی تحریروں سے قبل بذات خود بلوچوں میں تاریخ نویسی کا کوئی رواج نہ تھا بلکہ قدیم قبائلی طرز زندگی کی طرح وہ تمام تر تاریخ ازبر کر لیتے تھے جس

میں غلطیوں اور نامناسب اور محیر العقول اضافے ہوتے رہتے تھے مگر برطانیہ نے بلوچوں کی تاریخ اور جغرافیہ کو تحریری شکل دی اور مختلف اہل قلم نے اس سلسلے میں اپنی دانشوری کے جوہر دکھائے اور بلوچ قومی اور نسلی تاریخ پر رائے زنی کی۔ اس سلسلے میں کام کرنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے کہ جن میں کرنل موکلر، جی پی ٹیٹ، پروفیسر راؤلنسن، ہنری پوٹینگر، برنس، برٹن، ڈیمز، چارلس میسن وغیرشامل ہیں۔ برطانیہ کے مفادات کی خاطر سرگرم یہ حضرات برطانوی پالیسی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' پر سختی سے کاربند تھے اور اپنے ملکی مفادات کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھا رہے تھے ان کے عزائم اور بدنیتی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جتنے بھی برطانوی اور مغربی مورخین نے بلوچوں کی نسلی تاریخ پر رائے زنی کی ان میں سے کوئی بھی دو یا اس سے زیادہ افراد آپس میں کسی نقطے پر متفق نہیں ہیں۔ ان دانشورنما جاسوسوں نے کبھی بلوچوں کو ترکمان کہا تو کبھی آریا کسی نے عرب کہا تو کسی نے قدیم کلدانی کوئی انہیں راجپوتوں سے تشبیہہ دیتا ہے تو کوئی انہیں قدیم دراوڑ لکھتا ہے۔ صرف اسی ایک موضوع پر ان کے اختلافات سے ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ محض برطانوی توسیع پسندانہ عزائم کے لئے سرگرم تھے اور ہر لفظ کے لئے ڈکٹیشن لیتے تھے وگرنہ وہ نسلی یا قومی تاریخ میں نہ تو دراڑ پیدا کرتے، اور نہ اسے گنجلک اور پیچیدہ بناتے نہ اسے غلط انداز میں بیان کرتے اور نہ ہی وہ مستقبل کی بلوچ قوم اور دانشوروں کو کسی لاحاصل بحث میں ڈالتے۔

برطانوی جاسوسوں اور سرکاری نمائندوں (ایجنٹوں) کی بلوچ قومی و نسلی تاریخ پر کی جانے والی مباحثوں اور ان کے نتائج میں قائم کیے جانے والے اختلافی نظریوں نے بلوچ قومی و نسلی تاریخ کو شدید متاثر کیا اور آنے والے بلوچ

دانشوروں نے انہی برطانوی مواد کو سامنے رکھ کر اپنی اپنی تاریخیں رقم کیں اور بدقسمتی سے یہ دانشور بھی برطانوی سازش کا شکار ہو کر آپس میں نظریاتی اختلافات میں پڑ گئے۔ یہ بھی کسی ایک نقطے پر متفق نہ ہو سکے اور ہر دانشور نے اپنی پسند کے انگریز مورخ کے نظریے سے اتفاق کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بلوچ دانش وروں میں کوئی کلدانی نظریے کا حامی ہے ۔(1) تو کوئی بلوچوں کو آریا مانتا ہے (2) اگر کوئی انہیں عرب کہنے پر اصرار کرتا ہے(3) تو دوسرا انہیں ترکمان ماننے کی تلقین کرتا ہے(4) نظریات میں ان اختلافات کی وجہ انگریزی مواد سے استفادہ کرنا ہے وگرنہ انگریزی مواد ابتدائی یا پرائمری مواد نہیں ہے بلکہ عرب، فارسی اور یونانی ادوار میں لکھا جانے والا مواد بھی موجود ہے کہ جو نہ صرف سینکڑوں اور ہزاروں سال پرانا ہے بلکہ وہ انگریزی مواد کی مکمل نفی بھی کرتے ہیں۔ افسوس ہمارے مقامی مورخین کی بیشتر تعداد نے صرف انگریزی مواد کو ہی اپنا مطمع نظر مانا اور اسی سے متفق ہو کر ہر مورخ نے بلوچوں کو غیر ملکی اور مہاجر قرار دیا۔ مگر آج کا جدید مورخ کچھ اور سوچتا ہے۔ بلوچستان کے آثار قدیمہ کی دریافت اور ان سے برآمد ہونے والی اشیاء نے تقریباً برطانوی نظریات کو جو انہوں نے بلوچ قومی و نسلی تاریخ کے حوالے سے قائم کی تھیں رد کر دیا ہے اور ان برطانوی اثرات کو کہ جن کی وجہ سے تقریباً ڈیڑھ سو سالوں تک بلوچ قومی تاریخ متاثر ہوئی کو ختم یا زائل کرنے میں کامیاب ہوا۔

اسی طرح یہ برطانوی جاسوس بلوچستان کی تاریخ پر بھی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں اور اکثر کوئی مستند حوالہ دیئے بغیر وہ بلوچستان کے سیاسی ادوار کی نقشہ کشی کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر بلوچستان کو دیگر قوتوں کے زیر اثر ہونا تحریر کرتے

ہیں۔وہ بلوچستان کی آزادانہ حیثیت سے منکر نظر آتے ہیں۔مگر اس ضمن میں بھی ان میں اختلافات نظر آتے ہیں جو کہ برطانوی پالیسی کا ایک حصہ تھا یعنی مل جل کر ایسا اختلافی نقطہ نظر بیان کریں کہ جو آئندہ آنے والے بلوچ نسل کو بھی الجھائے رکھے اور اختلافات ومسائل کا شکار بھی بنائے رکھے۔جس طرح وہ بلوچستان کو دیگر قوتوں کا غلام بتاتے ہیں حقیقت تو یہ رہے کہ بلوچستان پر کبھی بھی کوئی بڑی طاقت جم کر حکومت نہیں کرسکی ہے۔زمانہ ماضی بعید سے تاحال اگر کبھی بڑی طاقت نے بلوچستان پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا یا یہاں فوج کشی کی تو جواباً شدید ردعمل اور مسلح مزاحمت سامنے آئی یونانی حملوں کے دوران لسبیلہ اور مکران میں شدید مزاحمت کی گئی (5) عرب حملوں کے دوران مکران اور جھلاوان مزاحمتی تاریخ کا حصہ بنے (6) منگول اور برطانوی راج کے خلاف طویل مسلح جدوجہد (7) تاریخ بلوچستان سے شغف اور دلچسپی رکھنے والے افراد سے چھپی نہیں ہے۔افغانستان نے بھی احمد شاہ ابدالی کے زیر قیادت بلوچستان پر ملکیتی دعوے کئے اور حملہ آور بھی ہوا مگر نتیجتاً وہ ایک معاہدے یعنی معاہدۂ قلات 1758ء کے تحت بلوچستان کی آزادانہ اور خودمختارانہ حیثیت ماننے پر مجبور ہوا (8) مگر برطانوی جاسوسوں اور ایجنٹوں نے اپنی دروغ بیانی کی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے بلوچستان کی تاریخ کے اکثر صفحات اپنی غلط بیانیوں کی نذر کئے بدقسمتی سے نسلی وقومی تاریخ کے موضوع کی طرح سیاسی تاریخ رقم کرتے وقت بھی یہ شاطر برطانوی ہر نقطہ پر آپس میں اختلاف رکھتے ہیں۔اس کی ایک چھوٹی سی مثال ایسے دی جاسکتی ہے کہ 1758ء کے معاہدہ قلات کی حقیقت تمام برطانوی مصنفین جانتے تھے مگر ماسوائے میلسن کے کسی نے اس پر لکھنے اور بحث کرنے کی زحمت نہیں کی اور نہ ہی اس کے شرائط کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی۔اسی طرح کوئٹہ سے قندھار تک کے خطے کا قدیم نام اور خصوصاً قندھار شہر کے

قدیم نام بیلوس BELOS سے تقریباً تمام برطانوی مورخین آگاہ تھے۔ ریورٹی اپنی کتاب Notes on Afghanistan and Balochistan میں اس لفظ کو بار بار تحریر بھی کرتا ہے(9) مگر اس کے باوجود وہ نہ تو اس پر تحقیق کی ضرورت محسوس کرتے ہیں نہ لفظ بیلوس جو واضح طور پر لفظ بلوچ کی پشتو زبان میں ادائیگی ہے، کی وضاحت کرتے ہیں اور نہ ہی اس بات کا کھوج لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر قندھار کا قدیم نام (عرب دور میں) بیلوس کیوں تھا اور کیوں عرب کوئٹہ سے قندھار تک کے خطے کو اسی نام سے پکارتے اور تحریر کرتے تھے(10) چونکہ برطانوی مفادات افغانستان کے ساتھ زیادہ گہرے تھے لہٰذا قندھار (جو کہ حقیقتاً بلوچ قبائل کی آماجگاہ رہنے کی وجہ سے بیلوس کہلاتا تھا) کی حقیقت پر افغانستان کی ناراضگی کے سبب روشنی نہیں ڈالی البتہ تحریر کرتے وقت وہ اس لفظ کو نظر انداز نہ کر سکے۔ کیونکہ تاریخ کی قدیم کتابوں میں یہ لفظ کثرت سے ملتا ہے(11)

اس طرح کی لاتعداد مثالیں برطانوی تحریروں میں ملتی ہیں کہ جن میں بلوچستان کی سیاسی تاریخ کو بری طرح پامال کرنے کی کوشش کی گئی اور حقائق کے منافی بیانات تحریر کئے گئے۔ ان تاریخ سے نابلد فوجیوں کے ان اقدامات سے بلوچستان کی سابقہ سیاسی تاریخ شدید متاثر ہوئی اور غیر بلوچ طبقات سمیت بلوچوں کے ایک وسیع طبقے کو بلوچستان کی سیاسی تاریخ کے حوالے سے غلط فہمی میں مبتلا کیا گیا۔ حتیٰ کہ وہ تاجر پیشہ قومیں کہ جو راہداری قلات حکومت سے لیتے تھے اور تجارتی سنگ یعنی محصول قلات حکومت کو ادا کرتے تھے سب کچھ جاننے کے باوجود کہ بلوچستان کی حیثیت آزادانہ رہی ہے وہ بھی برطانوی تحریروں کی غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے اور ان میں سے اکثر بلوچستان کو ماضی میں افغانستان کا ایک حصہ تصور کرتے تھے۔

حقیقت حال تو یہ ہے کہ بلوچستان ماضی بعید سے اب تک بڑی طاقتوں کے ساتھ اتحادی کی حیثیت سے رہا ہے اس نے اپنے اندرونی معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کی ۔ اس کی کئی مثالیں تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں ۔ چاہے وہ ہخامنشی دور ہو یا پھر عرب دور غزنوی حملے ہوں یا پھر منگول یلغار برطانوی عہد ہو یا پھر تقسیم ہند ۔ بلوچستان کی ان میں آزادانہ اور خودمختار حیثیت رہی ہے اور درج بالا ہر دور میں غالب قوتوں کے ساتھ ان کے تعلقات معاہدات کے ذریعے خوشگوار رہے ہیں اور بلوچستان نے ایک اتحادی Ally کی حیثیت سے ان کا ساتھ دیا ہے ۔ معاہدہ قلات 1758ء فیمابین افغانستان وبلوچستان اور برطانوی عہد کے لاتعداد معاہدات اس کے گواہ ہیں ۔

دراصل غالب اور حاکم قوتوں کا پہلا وار ہی تاریخ پر ہوتا ہے لہٰذا وہ مغلوب محکوم اقوام کی تاریخ اپنی مرضی ومنشاء کے مطابق تحریر کرتے ہیں اور اس کے لئے وہ اپنے آپ کو تاریخ نویسی کی پابندیوں سے آزاد اور مبراء سمجھتے ہیں ۔ البتہ جدید دور میں جوں جوں بلوچستان کی سیاسی تاریخ پر تحقیق اور تفتیش آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طریقوں اور ذرائع سے ہو رہی ہے یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ برطانوی تاریخ نویسی دراصل بلوچستان کی حقیقی تاریخ مسخ کرنے کی کوشش تھی ۔

وہ خطہ زمین کہ جہاں زمانہ قدیم سے بلوچ قبائل آباد رہتے چلے آرہے ہیں اس کا رقبہ بیان کرنا شاید آسان نہ ہو کیونکہ بلوچ قبائل شمال میں وسط ایشیا کی خطوں کے ساتھ منسلک ہیں تو جنوب میں ساحل مکران ان کی آماجگاہ ہے ۔ مشرق میں کوہ سلیمان سے لیکر مغرب میں ایرانی صوبہ کرمان تک ان کی قدیم آبادی کے آثار ملتے ہیں اور شمالی ایران میں کوہ البرز، مازندران اور گیلان کے صوبوں میں بھی ان کی

موجودگی کی تاریخ کے صفحات پر تفصیلات اورشہادتیں موجود ہیں۔ البتہ بلوچستان کی سیاسی وجغرافیائی حدبندی کا کل رقبہ مستند مورخین 3,40,000 مربع میل بیان کرتے ہیں (12) اور یہی درست ہے کیونکہ بلوچستان کی سیاسی حدبندی 1758ء کے معاہدے کے مطابق مسلم سمجھی جاتی ہے اور جو رقبہ میر نصیر خان نوری کے عہد 1749ء تا 1794ء کے دوران طے پایا تھا اس کا کل رقبہ یہی بیان کیا جاتا ہے۔ اور جس وقت برطانوی جاسوس یہاں آئے تو بلوچستان کا کل رقبہ بھی یہی تھا کیونکہ وہ میر نصیر خان کی رحلت کے فوراً بعد یہاں آئے تھے لہٰذا اس خطہ میں کوئی ردوبدل نہیں ہوا تھا ماسوائے کراچی بندرگاہ کے، کہ جس پر 1795ء میں تالپوروں نے قبضہ کرکے (13) اسے سندھ میں شامل کردیا تھا، وگرنہ باقی ماندہ بلوچستان اپنی پوری وسعت کے ساتھ قائم ودائم تھا۔ برطانوی جاسوسوں کی مختلف ٹولیوں نے بلوچستان کے مختلف خطوں کی سیاحت کی تھی کوئی ایک جاسوس پورا بلوچستان نہیں گھوما بلکہ ہر ایک کے لئے علاقے مخصوص کئے گئے تھے۔

ان برطانوی تحریروں میں نسلی وسیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے حقیقی جغرافیہ کو بھی بری طرح مسخ کرکے پیش کیا گیا۔ جغرافیائی تقسیم پر بھی یہ آپس میں شدید اختلافات رکھتے ہیں اور نہ تو حقیقی جغرافیہ کو مانتے ہیں اور نہ آپس میں کسی ایک رقبہ پر متفق ہیں۔ اے۔ ڈبلیو ہیوز A.W.Hughes تو بلوچستان کا رقبہ انتہائی بددیانتی اور بدنیتی کے ساتھ 1,40,000 مربع میل بیان کرتا ہے (14) جس میں 80,000 قلاتی بلوچستان جبکہ 60,000 ایرانی بلوچستان کا رقبہ لکھتا ہے (15) اور افغانی بلوچستان کو سرے سے بیان ہی نہیں کرتا۔ ایسے غیر منطقی اور غلط بیانات سے تاریخ شدید متاثر ہوتی ہے اور مستقبل میں اس سے کئی مسائل جنم لے سکتے ہیں۔

برطانیہ نے بلوچستان کے حصے بخرے کئے اور اس کے حقیقی جغرافیائی حدود کو شدید نقصان پہنچایا۔ وقتاً فوقتاً برطانوی سامراج نے ایران اور افغانستان میں اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر بلوچستان کے بعض حصے شامل کئےاور مشرق میں بعض بلوچ علاقوں کو پنجاب وسندھ میں شامل کر کے بلوچستان کے قدیم سیاسی جغرافیائی حدود کو پائمال کیااور اندرونی طور پر بھی بلوچستان میں ریاستی نظام قائم کر کے خاران، بیلہ اور مکران کو قلات سے جدا گانہ حیثیت دینے کی جسارت کی اور کوئٹہ نوشکی، نصیر آباد، کوہ سلیمان اور کئی دیگر علاقوں کو اجارے اور معاہدات کے ذریعے حاصل کر کے ایک الگ نام یعنی برٹش بلوچستان کا صوبہ بنایا اور اس طرح بلوچستان کے جغرافیائی حدود کو تباہ وبرباد کردیا گیا۔ لہٰذا ایسی شاطر اور سامراجی قوتوں کے دانشوروں سے کیسے یہ امید کی جاتی کہ وہ بلوچستان کے جغرافیائی حدود کو حقیقی معنوں اور بلوچ مفادات کے مطابق بیان کریں گے برطانوی مورخ نما جاسوسوں کا وار یقینا کاری تھا۔

برطانوی مصنفین نے بلوچ معاشرے کے خدوخال پر بھی طبع آزمائی کی اور اسے الفاظ میں بیان بھی کیا مگر یہ تمام کام سطحی تھا۔ انہوں نے بلوچ قبائلی معاشرتی نظام کے خدوخال کا ظاہری جائزہ لیکر اسے بس قبائلی نظام کا نام دیا۔ انہوں نے کبھی اس کے ارتقائی عمل کو کڑی درکڑی ملا کر اس کی اصل بنیاد کو واضح کرنے کی کوشش نہیں کی اور جس مصنف نے اس کی بنیادیں مختلف اقوام سے بھی ملائیں تو اس نظام قبائل کو اس بیان کردہ قدیم قوم کی بگڑی ہوئی شکل کہا حالانکہ درست حقیقت تو یہ ہے کہ بلوچ قبائلی نظام کو خود انگریزوں نے ہی بگاڑا۔ جنہوں نے قبائلی سرداروں اور معتبرین کو اپنی دھن دولت کے بل بوتے پر خرید کر اپنی مرضی کے نظام کو بلوچ قبائلی نظام کا نام دیکر بلوچ قبائل پر مسلط کیا اور بلوچ قبائلی نظام کی اصل اور قدیم روح کو فنا کردیا۔ سرداروں کو موروثی بنایا گیا۔ قبائل کو غلاموں کی

حیثیت دی گئی ۔ مالیاتی اور ارضیاتی تقسیم کو سردار پر چھوڑا گیا۔حتیٰ کہ ہر طرح سے قدیم بلوچ قبائلی نظام کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی گئی ۔ رابرٹ سنڈیمن کی اصلاحات لیوی سسٹم ، جرگہ سسٹم اور سنڈیمن سسٹم بلوچ قبائلی نظام کی تبدیلی کی بہترین مثالیں ہیں ۔(16) انگریزوں کی آمد سے قبل بلوچستان کا قبائلی نظام بالکل مختلف تھا۔ مستند بلوچ ذرائع اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ میر نصیر خان کے دور میں جب قبائلی اصلاحات کی گئیں تو سردار کے انتخاب کے لئے جمہوری اور خفیہ رائے دہی کا طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا یعنی خاندانی اور موروثی سرداریت اور حاکمیت ختم کردی گئی تھی جبکہ قبائل کو یہ اختیار حاصل تھا کہ نااہلیت کی بناپر اکثریت کی رائے سے سردار کو اس کے عہدے سے ہٹایا جاسکتا تھااور اس کی جگہ کوئی اہل شخص اس منصب پر فائز ہوتا (17) یعنی یہ کہ سردار اپنے قبیلے کا محافظ ہوا کرتا تھااور اس کے مفادات کے لئے کام کرتا تھا نہ کہ سردار قوم کو لوٹنے والا ڈاکو۔ جیسا کہ برطانیہ نے بعد ازاں اس کے اختیارات بڑھا کر اور اس کی موروثیت قائم کرکے اسے قوم کولوٹنے والا ڈاکو اور مارنے والا جلاد بنا دیا۔ ایک عام قبائلی فرد کو پس پشت ڈالا گیا۔ انگریزوں نے جوبھی اقدام کرنا ہوتا تو وہ صرف علاقائی اور قبائلی سرداروں کو اعتماد میں لیتا۔ استعمال سارا قبیلہ ہوتا مگران کی قیمت سردار وصول کرتا تھا اس طرح برطانوی ایجنٹوں نے بلوچستان کے ہزاروں سال سے قائم دائم قبائلی نظام کوتباہ وبرباد کرکے اپنے پسند کے قبائلی نظام کو متعارف کروایا۔ حالانکہ یہ بھی ایک درست اورنا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ بلوچوں میں سرداری کا کوئی رواج نہ تھا بلکہ وہ اپنے قبائلی میروں کے زیر سایہ پرسکون زندگی گذارتے تھے اور میرِ قبیلہ کی حالت ان سے کبھی مختلف نہ ہوتی تھی البتہ وہ دانائی اور قوت فیصلہ میں ان میں سے سب سے بہتر اور زیرک شخص ہوتا تھا۔ خود رند ولاشار یونین ایک ہی مشترکہ میر کے زیرِ اثر

رہتے تھے کہ جس کا انتخاب اس یونین میں شامل تمام قبائلی میر و معتبرین مل کر کرتے تھے۔اور یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ رند قبیلہ سے ہوتا بلکہ وہ کوئی بھی دانا شخص ہوتا کہ جوان کے مال اسباب اور جان و آبرو کی حفاظت کرسکتا۔اور جب اس طریقہ کی خلاف ورزی میر شہک سے ہوئی یعنی جب انہوں نے اپنے بیٹے میر چاکر کو اپنی طرف سے میر مقرر کیا تو اس کے بڑے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے اور لاشار قبائل اس یونین سے نکل گئے جس کی وجہ سے بلوچوں کی قوت دو حصوں میں بٹ گئی اور وہ آپس میں ہی برسرِ پیکار ہو گئے۔لہٰذا یہ کہنا کہ یہ بس صرف ایک قبائلی نظام تھا ہرگز درست نہیں ہے بلکہ یہ ایک قدیم اشتمالی طرز کا نظام حیات تھا کہ جسے انگریزوں نے بدترین طریقوں سے بگاڑ دیا۔برطانوی قبائلی اقدامات کے اثرات آج بھی بلوچ قبائل میں موجود ہیں اور جنکی وجہ سے عام لوگ قبائلی نظام کی اصل خوبیوں سے آگاہ نہیں اور اسے صرف سرداروں کے مفادات کا ذریعہ اور سرداری نظام سمجھ کر ٹھکرایا جاتا ہے حالانکہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے،اور سب سے پہلے اہم حقیقت تو یہ ہے کہ بلوچوں میں سرداری کا تصور بالکل نہیں تھا بلکہ ان کا قبائلی سربراہ میر کہلاتا ہے سردار کا ٹائٹل تو دراصل انگریزی تحفہ تھا جسے میر بلوچ نے قبول کیا۔

بلوچستان کے کمبرانی قبائل نے دیگر بلوچ قبائل کے ساتھ ملکر جس حکومت کا آغاز کیا تھا وہ مختلف مدراج اور نشیب وفراز طے کر کے آخر کار ایک قومی حکومت میں تبدیل ہو چکی تھی اور اس کا دائرہ کار اٹھارہویں صدی تک وسیع تر ہو چکا تھا۔خوانین قلات خصوصاً میر احمد خان اول ،میر عبداللہ خان قہار اور میر نصیر خان نوری نے بلوچستان کے جغرافیائی حدود کو لسانی اور قومی بنیادوں پر وسعت دی اور تمام بلوچ علاقوں کو یکجا کر کے انھیں قومی دھارے میں لانے میں کامیاب ہو گئے ۔ان حکمرانوں کی اعلیٰ خدمات کی بدولت عام بلوچ قبائلی ان سے بے پناہ محبت کرتا تھا

اوران کے ایک اشارے پر اپنی گردن اور اپنا خون انہیں پیش کرتا تھاان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ خان کی پہلی پکار پر اسلحہ بند ہو کر حاضر ہوتا تھا اور مشہد کے صحراؤں سے لے کر پانی پت کے میدانوں تک اپنا خون بہاتا رہتا تھا۔عوام نے اپنے حکمرانوں کو عظیم القابات عطا کئے تھے۔وہ انہیں قہار، کوہی وقاب، نوری، ولی وغیرہ القاب دیتے تھے اور جہاں یہ حکمران خصوصاً میر نصیر خان نوری دو رکعت نماز ادا کرتا تو لوگ وہاں پتھروں کی مسجد بنا کر اس جگہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مرکز سجود بناتے۔ آج بھی بلوچستان کی پہاڑی وادیوں، ریگستانوں اور میدانوں میں ایسی لاتعداد مساجد ہوں گی کہ جو میر نصیر خان نوری سے منسوب ہیں (18) اور بلوچ قوم کی اپنے عظیم حکمران سے دلی اور والہانہ محبت کا واضح ثبوت ہیں۔ کتب تواریخ میں بلوچ قوم کی اپنے حکمرانوں سے عقیدت ومحبت کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں بیرون دنیا میں خوانین قلات کا ایک اعلیٰ مرتبہ اور مقام تھا۔ ان کی اسلامی جہادی خدمات کے صلے میں مسلمان خلفاء اور دیگر حکمرانوں نے ان خوانین کو ہمیشہ قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا اور انہیں برادرِ وفادار اور بیگلر بیگی جیسے عظیم خطابات والقابات سے نوازا تھا (19) مختصراً یہ کہ ان خوانین بلوچ نے محنت شاقہ سے یہ القاب اور خطاب حاصل کئے تھے اور بڑی جدوجہد اور محنت کے بعد بلوچ قوم اور بیرون دنیا میں مقام ومرتبہ حاصل کیا تھا۔بلوچستان کے دربار میں بیرونی سفیر اور بلوچستان کے سفیر دنیا کے دیگر مما لک میں آتے جاتے اور سرکاری طور پر تعینات ہوتے تھے اور دنیا کے نقشے پر بلوچستان ایک خود دار، آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔

مگر میر نصیر خان نوری کی رحلت، نئے مقرر کردہ خان کی کمسنی، سرداروں کی سرکشی اور درباری وزراء کی غلامانہ اور سازشی ذہنیت نے مملکت بلوچستان کی عظمت کو ڈھیرے ڈھیرے طشت ازبام کردیا اور بہت جلد درباری غداروں اور قوم فروش

سرداروں کے بلاوے اور تعاون سے انڈس آرمی نے انگریز جرنیلوں کی سرکردگی میں پورے ملک بلوچستان کو خاک وخون میں ملا دیا اور بلوچستان میں تباہی وبربادی برپا کردی۔ اگر انگریزی قبضے کا الزام صرف قبائلی سرداروں یا درباری غداروں کو دیا جائے تو شاید درست نہ ہو کیونکہ بذات خود خوانین قلات بھی اس کے ذمہ دار تھے کہ جن کی ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے انگریز جاسوس اس خطے میں آئے مگر خان میر محمود خان اور اس کے بھائی اور رفقاء ان جاسوسوں کی اصلیت سے ناواقف رہے۔ یہ ان کے نظام کی کمزوری تھی کہ غیر ملکی جاسوس دارالحکومت کے اندر ہفتوں نہ صرف قیام پذیر رہے بلکہ شاہی خاندان کے افراد نے ان کی باقاعدہ مہمان نوازی بھی کی (20) پوٹینگر، کرسٹی، گرانٹ اور اے ڈبلیو ہیوز پورے بلوچستان میں دندناتے پھر رہے تھے اور ان کی اصلیت سے بے خبر بلوچ قوم ان کے اور ان کے سواری کے جانوروں کی دانہ پانی کی فکر میں لگی رہی۔ حتیٰ کہ حکمرانوں کی اپنے عوام سے دلچسپی اور ان کے فلاح وبہبود اور دنیاوی شعور سے آگہی کے لئے کی جانے والی کوششوں کی حالت یہ تھی کہ جب بیسویں صدی کی تیسری دھائی میں جنرل ڈائر اپنی گاڑی میں بلوچ علاقوں میں مٹر گشت کررہا تھا تو بلوچ عوام اس کے عجیب وغریب جانور کو دیکھ کر ڈر گئے تھے اور حیران ہوتے تھے اور ساتھ ہی اس کے لئے چارہ پانی لے آتے تھے۔ یقیناً حکمران اتنا نااہل ہو تو اس کے اثرات اس کے ملک وقوم پر ضرور پڑتے ہیں۔ انگریزوں نے بھی خوانین قلات کی کمزوریوں سے آگاہی حاصل کرلی تھی اور وہ اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے سے آگاہ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان خوانین اور ان کے سرداروں کو خوش آمد، چاپلوسی اور مادی اشیاء دولت سے خریدا جاسکتا ہے لہٰذا وہ وظیفوں، انعامات اور تحفوں کے بدلے ان حکمرانوں کو اپنے معاہدات کے جال میں پھانستے چلے گئے اور اپے درپے معاہدات

کے ذریعے ان کے ملک کا بیشتر حصہ ہتھیالیا اور ساتھ ہی آہستہ آہستہ خوانین قلات کی وہ حالت کردی کہ ایک عام برطانوی فوجی جنرل براؤن نے خان خدائیداد خان جیسے باجبروت حکمران کو گرفتار کرلیا(21) اور اس کی حکمرانی ختم کر کے اس کے نااہل بیٹے کو اس کا جانشین مقرر کیا۔ گوکہ انگریزوں کے اس ناروا عمل کے خلاف بلوچ قبائل نے بغاوت بھی کی مگر اس سے کچھ نہ بن سکا اور خوانین قلات کا مقام ومرتبہ سب کے سامنے آیا۔ بیسویں صدی میں تو خوانین کی حیثیت صرف ایک ربڑ سٹیمپ کی سی تھی اور سارے اختیارات کا مالک برطانوی نمائندہ ہوتا تھا۔ مختصراً یہ کہ برطانوی جاسوسوں نے خوانین کی کمزوریوں کو بھانپ لیا تھا اور ان کے بعد آنے والوں نے آسانی کے ساتھ ان حکمرانوں اور ان کے قبائلی سرداروں کو خرید کرانہیں، ان کے عوام اور ان کے ملک کو تقریباً سو سال کے لئے اپنا غلام بنالیا اور خوانین قلات نے اپنے آباؤ اجداد کے اس مقام اور مرتبے کو کھودیا کہ جس کے حصول کے لئے میر احمد خان، میر محراب خان اول، میر عبداللہ قہار نے اپنا خون بہایا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ خوانین قلات محتاجوں، فقیروں، سادھوؤں، علماء، طلباء، غربا اور دیگر کئی طبقات کے لوگوں کو خیرات اور وظائف دیا کرتے تھے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خوانین قلات اور اس کے بااثر قبائلی سردار برطانوی ایجنٹ سے اپنا وظیفہ اور تنخواہ وصول کرنے لگے۔ المختصر یہ کہ خوانین کا وہ سابقہ جاہ وجلال اور مقام ومرتبہ برطانوی ایجنٹوں کی آمد اور برطانوی فوجیوں کے قبضے کے بعد قصہ پارینہ بن چکا تھا۔

انگریزی قبضہ واختیار سے قبل گوکہ بلوچستان میں طبقات ضرور موجود تھے اور امیر وغریب کا فرق بھی موجود تھا مگر اس قدر نہیں تھا کہ یہ طبقات ایک دوسرے سے دور ہوتے بلکہ ایک عام قبائلی اپنے سردار کے پاس جاسکتا تھا اپنا مدعا بیان کر سکتا تھا اور اپنا مسئلہ حل کرواسکتا تھا۔ اگر سردار نااہل ہوتا تو قبائلی معتبرین، مَلِک

اور ٹکری ملکر اس کا محاسبہ کرسکتے تھے اور اسے اس کے عہدے سے طریقہ کار کے مطابق ہٹا سکتے تھے۔ ایک مسافر افغانستان سے ساحل مکران یا حدود سندھ و ہند تک حفظ و امن میں رہتا تھا اور بلا خطر خطہ بلوچستان میں سفر کرسکتا تھا۔ اسے کسی قسم کا خوف و ہراس نہیں ہوتا تھا مگر برطانوی قبضے اور سرداروں کو کھلم کھلا اختیارات نے طبقاتی تقسیم کے عمل کو تیز تر کیا۔ امیر و غریب کا فرق واضح ہونے لگا۔ سردار سینکڑوں محافظوں کی جلو میں حرکت کرنے لگا۔ اپنے عام قبائلی فرد سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا اور عام قبائلی کی حیثیت ایک غلام کی سی ہو کر رہ گئی راستے غیر محفوظ ہو گئے سردار کے سپاہی اور گماشتے لوٹ مار میں مصروف ہو گئے۔ عام قبائیلیوں سے ناجائز ٹیکس لیا جانے لگا۔ ان کو جبری مشقت میں لگایا گیا۔ حتیٰ کہ قبائلی کا پورا خاندان پیر و جوان، خورد و کلاں، زن و مرد سب کے سب سردار کے غلام بن گئے کچھ اس کی زمینوں پر کام کرتے تھے کچھ گھروں میں کام کرتے تھے اور جوانوں سے سپاہی اور محافظت کا کام لیا جانے لگا تھا۔ ہر سردار نے اپنی ذاتی فوج بنائی اور اسی فوج کو اکثر و بیشتر انگریزوں کے ایما پر اپنی ہی ریاست اور اپنے ہی حکمران کے خلاف استعمال کیا، کبھی اس فوج سے اس نے دہلی یا مشہد کے میدانوں و صحراؤں کو مسخر نہیں کیا بلکہ ہمیشہ قلات نصیری کی دیواروں میں شگاف ڈالتا رہا۔ سرداروں کی موروثیت قبائل اور طبقہ اعلیٰ کے مابین خلیج کو وسیع تر کرتا گیا اور یہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے نہ صرف بیگانہ ہوتے گئے بلکہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بھی بن گئے۔ کہاں وہ سردار جو دور قہاری اور دور نصیری میں اپنے قبیلے کی جلو میں ایران و ہند کی سرزمین کو مسخر کر رہا تھا اور اب کہاں وہ جو اپنے قبیلے سے دور بھاگتا تھا اور گنتی کے چند بندوق برداروں کے جھرمٹ میں برطانوی لارڈ کی قدم بوسی کو کبھی کوئٹہ کبھی سبی حاضر ہونے لگا تھا۔ حتیٰ کہ حالت یہ تھی کہ ایک عام قبائلی پہاڑوں کو مسکن بنا کر برطانوی تسلط

کے خلاف لڑ رہا تھا جبکہ اس کا سردار بسی میں انگریز لارڈ کی بگھی کھینچ رہا تھا۔ ایک قبائلی بہادر انگریز جنرل براؤن کے کوہلو میں جوتے اتار کر اسے ننگے پاؤں نصیر آباد کے کیمپ کی جانب ہانک رہا تھا (22) جبکہ دوسری جانب قبائلی سردار انگریز لارڈ کے جوتے صاف کرر ہے تھے۔ چھوٹے درجے کے تمام پیشے اور کاروبار سے سردار صاحب کتراتے تھے اور براہ راست انگریز لارڈ سے رقم وصول کرتے تھے جبکہ کاروبار یعنی زراعت ، مال مویشی ، دکانداری ، ماہی گیری وغیرہ قبائلی کرتے تھے جبکہ سرداران سے اپنا حصہ وصول کرتے تھے۔ بلوچستان میں طبقات نے ہندو معاشرے کی شکل اختیار کی تھی ۔ درزادہ ، نقیب ، ڈومب اور لوڑی ایسے طبقات تھے کہ سردار تو کجا ایک عام قبائلی بھی ان سے ہاتھ تک نہ ملاتا تھا بلکہ تمام تر خدمات وہ سرانجام دینے کے باوجود تذلیل سے دوچار ہوتے تھے ۔ انکی حیثیت ایسے غلاموں کی سی ہو کر رہ گئی تھی کہ جن کی کوئی قیمت اور اہمیت نہیں تھی ، حتیٰ کہ انگریزوں کا یہ تحفہ آج تک بلوچ معاشرے میں ناسور کی طرح موجود ہے۔ حالانکہ یہ طبقات انگریزوں کی آمد سے قبل بھی موجود تھے مگر ان کو مقام و مرتبہ حاصل تھا اور بعض مخصوص کام ان کے ذمے تھے جو وہ ذمہ داری اور تندہی سے ادا کرتے تھے اور قبائلی سردار و عوام ان کی عزت و توقیر کرتے تھے ۔ ان کے ، نان نفقے اور علاج معالجے کا خیال رکھتے تھے ان کو خرچ و اخراجات دیتے تھے اور ان کی محافظت کرتے تھے ۔ یہ جس قبیلے سے منسلک ہوتے اسی قبیلے کے افراد کہلاتے اور ان کو تمام تر قبائلی حقوق حاصل ہوتے تھے ۔ برطانوی قبضے کے ساتھ ہی طبقہ اعلیٰ مزید امیر ہوتا گیا اور غریب غریب تر۔ لہٰذا ان کے مابین خلیج بڑھتی گئی ۔ لوڑی تو درکنار ، ایک اصل قبائلی سے اس کی غربت اور مفلسی کی بنا پر طبقہ اعلی یعنی سردار و میر معتبر صاحبان ملنے یا اٹھنے بیٹھنے سے کتراتے تھے حالانکہ برطانوی مداخلت سے قبل یہ کمتر درجات کے

ہنر مند لوگ ہر سفر میں سردار کے ساتھ ہمرکاب ہوتے تھے۔کوئی اس کے لئے ہتھیار بناتا، کوئی سازوزیمل سے اس کا دل بہلاتا کوئی اس کے کھانے پینے کا بندوبست کرتا تو کوئی اس کی خدمت کرتا اوراس کے ہاتھ پاؤں دباتا، اوراکثر وبیشتر سرداران سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے ان کی تعظیم کرتے اور ان کے اخراجات پورے کرتے۔مگر برطانوی مداخلت کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوااور یہ طبقات معاشرے میں رذیل و ذلیل ہوتے گئے۔ گوکہ برطانیہ نے 1926ء میں ایک قانونی مسودے کے ذریعہ غلامی کے خاتمہ کااعلان کردیا تھامگراس کے باوجود یہ طبقاتی تقسیم برطانوی عہدتک نہ صرف برقرار رہی بلکہ اس میں اتنی زیادہ شدت آ گئی کہ اس جدید دور میں بھی بلوچستان ان اثرات کی لپیٹ میں ہے البتہ باشعور اور نوجوان طبقے نے اپنی بے مثال جدوجہداور کوشش سے بلوچستان کے کئی علاقوں سے اس سوچ وفکر اور طبقاتی تقسیم کوختم کردیا ہےاور باقیماندہ علاقوں میں بھی یہ سوچ اورطبقاتی تفریق ختم ہوتی جارہی ہے۔

آرین حملوں کے بعد سے لے کر آج تک یعنی موجود ہ دور تک بلوچستان کی تاریخ غیرملکی حملہ آوروں اور قبضہ گیروں کے خلاف رزم آرائی سے مزین ہے۔میر احمد یار خان نے کیا خوب لکھا ہے کہ :

''ہمیشہ ہم بلوچوں کا مقابلہ اپنے سے زیادہ طاقتوراور باجبروت حکومتوں سے رہا ہے۔ بلوچوں نے آرام سے بیٹھ کر کبھی بھی بزم آرائی نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ میدان رزم کی گرم بازاری ہی ان کے حصے میں آتی رہی ہے، اورانہوں نے اپنی ساری زندگی مدافعانہ جنگ وجدال کی صورت میں گزاردی ہے۔تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ شہنشاہ مغل، شہنشاہ ایران، شاہ افغانستان، پنجاب کے سکھ، سندھ کے حکمران،

حکومت برطانیہ اور حکومت پاکستان سے بلوچوں کا مقابلہ رہا ہے۔ بلوچوں نے متذکرۃ الفوق کسی بھی حکومت پر جوع الارض اور کشور کشائی کی خاطر حملہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ ہمیشہ اپنی عزت وناموس، قدیمی بلوچی روایات اور بلوچی حکومت کی حفاظت کی خاطر مدافعانہ جنگ لڑتے رہنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔"(23)

گو میر مہراب خان کی شہادت کے وقت بلوچ قبائل نے محراب خان کی اپنی متشددانہ پالیسیوں اور سرداروں کے ایماء پر اس کی امداد نہ کی مگر یہ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ انگریز میر محراب خان کو شہید کر دیں گے۔ لہٰذا خان کی شہادت کے بعد بلوچ قبائل نے اپنے غم وغصے کا اظہار ہمیشہ کی طرح کیا اور برطانوی تسلط کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے اور مسلح جدوجہد شروع کی۔ یہ مسلح جدوجہد 1839ء سے 1920ء تک جاری رہی اور بلوچ تاریخ میں کئی نامور جنگبازوں کا اضافہ ہوا اور جہد مسلسل اور قربانیوں کی ایک نئی تاریخ رقم ہوتی رہی۔ اب بلوچ قبائلی کسی پوٹینگر یا کرسٹی کی مہمان نوازی نہیں کرسکتا تھا کہ جنہوں نے ان کی نمک اور پانی کا اچھا حق ادا کیا تھا۔ لہٰذا اب مہمان نوازی کی بجائے پوٹینگر نہ سہی لوڈے ہی سہی، اس کو قتل کر دیا گیا۔(24)

برطانوی قبضہ واختیار کی تاریخ بلوچ مزاحمتی جدوجہد سے بھرپور ہے۔ گوکہ برطانوی سامراج ان جنگبازوں کو باغی قرار دیتا ہے مگر بلوچی تاریخ میں ان کا درجہ قومی ہیرو کا ہے۔ ان جانبازوں میں سردار گوہر خان زرکزئی، یوسف خان زرکزئی، نواب خان محمد زرکزئی۔ میر محراب خان گچکی، میر بلوچ خان نوشیروانی، نورا مینگل، سلیمان گرگناڑی، نواب خیر بخش مری اول، میر خدائیداد خان بجارانی مری، غلام حسین بگٹی، سردار شہسوار خان محمدزئی، سردار جیئند خان گمشادزئی، سردار خلیل

خان وغیرہ ایسے سینکڑوں کردار ہیں کہ جنہوں نے برطانوی سامراج کو للکارا اور اپنے انتہائی محدود ذرائع اور وسائل کے باوجود اپنے وقت کی عالمی طاقت کے خلاف رزم آرائی کی نئی تاریخ رقم کرتے رہے۔

1839ء میں قلات پر انگریزی حملے کے بعد بلوچستان بھر میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی ایک شدید لہر دوڑ گئی اور قبائل مسلح جدوجہد کی خاطر پہاڑوں پر چلے گئے مگر یہ طویل اور غیر منظم بغاوت جو وقتاً فوقتاً برطانوی جارحیت کے خلاف جاری رہی کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی اور 1920ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر برطانوی تسلط، اثرات اور اقدامات کو روکنے اور بلوچ قوم کو ایک سیاسی پلیٹ فارم مہیا کرنے کی خاطر 1920ء میں میر عبدالعزیز کرد نے ینگ بلوچ نامی خفیہ تنظیم بنائی۔ بعد ازاں 1929ء میں میر یوسف عزیز مگسی بھی اس میں شامل ہوگئے اور 1931ء میں انہوں نے انجمن اتحاد بلوچاں کی داغ بیل ڈالی۔(25) اس طرح بلوچستان میں مسلح بغاوت کے ساتھ ساتھ آئینی جدوجہد کا بھی آغاز ہوا۔ انجمن اتحاد بلوچاں نے بہت جلد بلوچ عوام میں زبردست مقبولیت حاصل کی اور برطانوی نامزد کردہ وزیر اعظم سر شمس شاہ کو بہت جلد اقتدار چھوڑ کر گجرات جانے پر مجبور کیا۔ بعد ازاں وقتاً فوقتاً بلوچستان میں سیاسی پارٹیاں تشکیل پاتی رہیں مثلاً انجمن اتحاد بلوچاں، انجمن اسلامیہ، انجمن وطن، ورور پشتون، قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی وغیرہ جو سب برطانوی تسلط اور اس کے سامراجی اقدامات کی وجہ سے بنیں۔ انہوں نے برطانیہ کے قبضہ و نوآبادیاتی نظام کی مخالفت اور خاتمہ کے لیے تاریخی کردار ادا کیا۔ اس طرح کم از کم برطانوی جاسوسوں، ایجنٹوں اور بعد ازاں افواج کے آنے اور قلات پر قبضے نے بالآخر آہستہ آہستہ بلوچ قوم کو مزاحمتی اور سیاسی جدوجہد پر ابھارا

اور بلوچستان میں جدید سیاسی سوچ پروان چڑھتی رہی ایک طرف سیاسی جدوجہد۔ دوسری طرف مسلح بغاوت اور تیسری جانب ہندوستان میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں نے بالآخر انگریزوں کو ہندوستانی اور دیگر نوآبادیاتی ریاستوں کی آزادی پر مجبور کیا۔ دوسری جنگ عظیم کی تباہیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور آخر کار دوسال کے اندر اندر انگریزوں نے برصغیر کی تقسیم کے ساتھ بلوچستان کی آزادی کا بھی اعلان کر دیا۔

انگریزوں کی آمد سے قبل بلاشبہ بلوچستان یا بلوچ قوم میں تحریر وخواندگی کا کوئی رواج نہ تھا مگر ان کا ادب تاریخ نویسی، شاعری ، افسانہ، ڈرامہ ، ناول جیسے خیالات وتاثرات سے بھر پور تھا۔ بلوچی اور براہوئی زبانوں کی قدامت میں کوئی شک نہیں ۔ یہ ہزاروں سالہ قدیم زبانیں ہیں جو اپنے محل وقوع کے علاوہ ایران، افغانستان، وسطی ایشیاء کے چند ممالک، خلیجی عرب ممالک،سندھ، پنجاب اور ہندوستان تک میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ان زبانوں کا دائرہ کار بے شک بہت وسیع ہے اور بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بھی حوصلہ افزاء ہے مگر بدقسمتی سے ماضی میں نہ تو حکومتوں نے ان زبانوں کی ترویج وترقی پر کوئی توجہ دی اور نہ ہی خود بلوچ قبائل میں خواندگی کا کوئی رجحان تھا۔ نہ ہی بلوچوں نے تاریخ نویسی کی اور نہ ہی زبان وادب کوتحریری شکل دی تھی ۔ چونکہ بلوچستان ہمیشہ بیرونی حملوں اورقبضوں کی زد میں رہا اور ہمیشہ طاقتور قوموں نے اسے فوجی اور تجارتی گزرگاہ کے طور پر استعمال کیا۔لہٰذا انہوں نے مقامی زبانوں کوترقی دینے کی بجائے ان پر ہمیشہ اپنی زبانوں مثلاً عربی ، فارسی وغیرہ کو مسلط کیا لہٰذا اگر یہاں سے کوئی خواندہ شخص ہوتا بھی تو بھی اس کی تمام تر تعلیم عربی یا فارسی میں ہوتی تھی نہ کہ بلوچی یا براہوئی میں۔ میر نصیر خان

نوری کے دور میں جتنے مدارس قائم ہوئے ان میں بھی بلوچی یا براہوئی زبانوں کی تعلیم مفقود تھی اور ذریعہ تعلیم فارسی اور عربی زبانیں تھیں۔لہٰذا ان وجوہات کی بنا پر بلوچی وبراہوئی زبان وادب ترقی نہ کرسکیں اور یہ زبانیں صرف بولنے کی حد تک محدود رہیں۔حالانکہ بلوچی میں اشعار کا سلسلہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا تھا اور بڑے بڑے قبائلی سردار حتیٰ کہ خوانین قلات بھی شاعری کرتے تھے مگر وہ انہیں تحریر کرنے کی بجائے میراثیوں (ڈومب) کو زبانی سناتے تھے۔یہ ڈومب بلا کے ذہین ہوتے تھے کہ جوایک بار یہ اشعار سن کرانہیں نہ صرف ازبر کرلیتے تھے بلکہ انہیں نسل درنسل منتقل بھی کرتے تھے۔رندولاشار دور میں اس شاعری نے کمال عروج حاصل کیا اور شاعری کی کئی اصناف کو متعارف کروایا۔مگر صدیوں تک شاعری کا سلسلہ ازبر طریقے سے چلتا رہا۔تا آنکہ مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز نے اس تمام سلسلے کو کتابی شکل دی۔ 1907ء میں اس صدیوں پرانی شاعری نے بالآخر تحریری شکل پالی۔مگر یقینی بات ہے کہ یہ ہونے والی شاعری کا ایک فیصد بھی نہ ہوگا کیونکہ پندرہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک سینکڑوں بلکہ ہزاروں شاعر آئے ہوں گے۔جن کا کلام زمانے کے ساتھ ساتھ فنا ہوچکا ہوگا۔مگر یہ احسان بھی کم نہ تھا کہ ڈیمز نے کسی نہ کسی حد تک اس شاعری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہونے سے بچالیا،لہٰذا ڈیمز کے بعد بھی مقامی سطح پر بلوچی زبان وادب پر لکھنے اور انہیں محفوظ کرنے کا سلسلہ شروع ہوااور بیسویں صدی میں بے شمار مصنفین نے اس سلسلے میں کام کیا اور بلوچی زبان کی زبانی روایات کوزندہ رکھنے کے ساتھ انہیں تحریری شکل دینے کا مستحسن کام کیا۔مگر یہ یادرکھنا چاہیے کہ اس سلسلے کو پہلی جنبش قبضہ گیر انگریز نے دی تھی۔

ڈیمز سے قبل جب برطانوی تبلیغی مشن نے براہوئی زبان بولنے والے بلوچ علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور براہوئی قبائل میں عیسائیت پھیلانے کی خاطر براہوئی زبان میں بائبل کا ترجمہ کر کے اس کی کاپیاں لوگوں میں تقسیم کرنے لگے تو براہوئی زبان کے ممتاز عالم دین اور مجاہد مولانا محمد عمر دین پوری نے قرآن پاک کا براہوئی زبان میں ترجمہ کر کے براہوئی قبائل کو اسلام پر کاربند رکھا اور عیسائی تبلیغی مشن کے مقاصد اور کوششوں کو ناکام بنایا۔ یہ قرآن پاک کا براہوئی زبان میں پہلا ترجمہ تھا۔

اسی طرح کوردگال نامک نامی کتاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے خوانین قلات کے ادوار میں آخوند صالح محمد نے تحریر کیا تھا مگر اس کتاب کی اصلیت اور استناد میں شک ہے۔ البتہ آخوند محمد صدیق نے (جو کہ میر محراب خان کے دور میں وزیر اعظم قلات تھا اور اسے میر خدائیداد خان اور اس کے بڑے بھائی میر نصیر خان ثانی نے وزارت سے ہٹا دیا تھا کیونکہ وہ اس پر بھروسہ نہیں کرتے تھے اور اسے انگریزوں کا ایجنٹ سمجھتے تھے) اخبار الابرار نامی کتاب تحریر کی ہے مگر یہ فارسی میں لکھی گئی ہے اور اس کا اردو میں ترجمہ میر گل خان نصیر نے تاریخ خوانین قلات کے عنوان سے کیا ہے۔

البتہ انگریزوں کی متعارف کردہ طریقے کے مطابق بلوچستان میں بلوچی اور براہوئی زبانوں پر باقاعدہ اور وسیع ترکام کا آغاز بیسیوں صدی کے آغاز میں ہوا۔ یہ برطانوی جاسوسوں کی آمد ان کی تحریروں اور بعد ازاں دیگر انگریزوں کی تحریروں کا ہی اثر تھا کہ بلوچستان میں بھی زبان وادب اور تاریخ کو محفوظ و مامون رکھنے کی خاطر تحریر و اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اور ان زبانوں کی ترقی و ترویج شروع ہوئی اور آج یقیناً براہوئی ایک اہم ترین اور بلوچی عالمی زبان کا درجہ اختیار کر چکی ہیں، ان دونوں زبانوں اور بلوچستان کی تاریخ وادب پر لکھنے والے لاتعداد علماء کی بے شمار کتابیں

دستیاب ہیں جو یقیناً اہم ترین نسخہ جات ترقی وترویج زبان وادب بلوچی وبراہوئی مانے جاتے ہیں۔

وہ قوم کہ جس کی آمد کی وجہ سے بلوچی وبراہوئی زبان میں تحریر وچھپائی کا سلسلہ شروع ہوا اور جنہوں نے بلوچ اور براہوئی قبائل کے لئے وحشی اور غیر مہذب جیسے ناشائستہ الفاظ استعمال کئے آج ان ہی مما لک کے نشریاتی ادارے بلوچی زبان میں طویل پروگرام پیش کرتے ہیں۔

برطانیہ کی آمد اور قبضہ اور بالخصوص جاسوسوں کی معلومات اور تحریروں نے بلوچستان کو برطانیہ کے لئے انتہائی اہم قرار دیا اور برطانیہ نے جس طرح یہاں اپنا تسلط قائم کیا اور اس خطہ کو اپنے دائرہ اختیار میں لیا تو یقیناً کسی بھی ملک کے ایسے عمل سے دوسرا ملک اور معاشرہ شدید طور پر متاثر ہوتا ہے۔ جدید دور میں بھی اس کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں لہٰذا بلوچستان بھی برطانوی تسلط کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ اثرات جن کا تذکرہ درج بالا اوراق میں ہوچکا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بلوچستان کئی طرح سے متاثر ہوا۔ البتہ جس طرح درج بالا اوراق میں مذکور اثرات میں سے بعض انتہائی منفی نتائج کے حامل تھے تو چند ایک اچھے اور مثبت اثرات بھی رکھتے تھے۔ بہرحال یہ یقینی بات ہے کہ برطانیہ یا کوئی بھی دوسرا فاتح، مفتوح کی فلاح وبہبود اور ترقی کی خواہش نہیں رکھتا بلکہ اسے صرف اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ اور وہ جو بھی عمل کرتا ہے اس میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے مگر حقیقت نہیں چھپ سکتی اور آنے والا وقت تحقیق وتفتیش سے ان حقائق کو آشکارا کرتا ہے کہ جنہیں بددیانت فاتح نے وقت کی راکھ میں دفن کیا تھا اور آج وہی برطانوی الفاظ تحقیق کے بعد نہ صرف یہ کہ غلط ثابت ہورہے ہیں بلکہ اصل حقیقت کہ جنہیں انہوں نے دفن کردیا تھا دوبارہ جی اٹھی ہے۔

حوالہ جات:

1. محمد سردار خان بلوچ، ہسٹری آف بلوچ ریس، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1958، 6

2. شاہ محمد مری، بلوچ قوم قدیم عہد سے عصر حاضر تک، تخلیقات، لاہور، 2000، 43

3. میر احمد یار خان بلوچ، تاریخ خوانین بلوچ، اسلامیہ پریس، کوئٹہ، 1974، 9

4. آغا نصیر خان احمدزئی کمبرانی، تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد اول)، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1982، 5

5. میک کرنڈل، انویژن آف انڈیا بائے الیگزینڈر دی گریٹ، انڈس پبلیکیشنز، کراچی، 1982، 21,22

6. ہیرلڈ لیم۔سکندر اعظم، مترجم، غلام رسول مہر، فکشن ہاؤس، لاہور، 2006، سیکنڈ ایڈیشن

7. ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی، بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور حکومتیں، زمرد پبلیکیشنز، مستونگ، 1998، 112

8. گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1990، 214

9. ایچ۔جی۔ ریورٹی، سرزمین افغان و بلوچ، مترجم: پروفیسر سعید احمد رفیق، نساء ٹریڈرز، 1999، 02 ,801

10. جی۔لی، سٹرینج، جغرافیہ خلافت مشرقی، مترجم: محمد جمیل الرحمان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1986، 501

11. مولانا منہاج الدین سراج، طبقات ناصری، انگریزی ترجمہ، ایچ۔جی۔ ریورٹی، ایشیاءٹک سوسائیٹی، کلکتہ، انڈیا، 1995 (سیکنڈ ایڈیشن)، 1018

12. عنایت اللہ بلوچ، دی پرابلم آف گریٹر بلوچستان، جی ایم بی ایچ، سٹٹ گرٹ، جرمنی، 1987، 19

13. احمد حسین صدیقی، گوہر بحیرہ عرب (کراچی) محمد حسین اکیڈمی، فیڈرل بی ایریا، کراچی، 1995، 14

14. اے ڈبلیو ہیوز، دی کنٹری آف بلوچستان، مترجم، ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 2011، سیکنڈ ایڈیشن، 12

15. ایضاً، 23-22

16. ایضاً، 228

17. میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، قلات پبلشرز، کوئٹہ، 2000، 91

18. بلوچ، فاروق، خان اعظم میر نصیر خان نوری، حکومت، سیاست، کردار اور شخصیت، فکشن ہاؤس، لاہور، 2012، 220

19. ایضاً، 225

20. ہنری پوٹینگر، ٹریول ان سندھ اینڈ بلوچستان، مترجم: پروفیسر ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1983، سیکنڈ ایڈیشن، 58

21. میر گل خان نصیر، 313,14

22. ایضاً، 146-48,156-59

23. میر احمد یار خان بلوچ، 3

24. میر گل خان نصیر، 162

25. ڈاکٹر شاہ محمد مری، 271

حرف آخر

اس طویل بحث میں کئی ایسی باتوں کا انکشاف ہوا کہ جن پر ماضی میں کبھی غور نہیں کیا گیا اور نہ ہی ان اہم باتوں پر سنجیدگی سے توجہ دی گئی۔ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ برطانیہ سمیت ہر وہ طاقت ورقوت جو خطہ بلوچستان پر قابض رہی اس کی حیثیت ایک فاتح کی سی تھی۔ لہٰذا اس حقیقت کو بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ فاتح کبھی بھی مفتوح کا خیر خواہ نہیں ہوتا۔ برطانیہ جو سات سمندر پار سے اس انجان خطے میں آیا تھا تو کیا اس کا مقصد اپنا وقت، اپنی دولت، اپنا علم اور اپنا ہنر ان مفتوح باشندوں کو دینا تھا یا یہ کہ وہ اس (بقول برطانوی مورخین) وحشی، غیر مہذب اور بوسیدہ قوم کو ترقی اور تہذیب سکھانے آیا تھا۔ یقیناً برطانیہ کے ایسے مقاصد ہر گز ہر گز نہ تھے بلکہ اس کے اپنے مفادات تھے کہ جو اس گذشتہ طویل بحث سمیت بیسیوؤں دیگر تاریخی کتب میں مذکور ہیں۔ لہٰذا بلوچستان پر قبضہ اور یہاں ہر حوالے سے اپنے مقاصد کے لئے کام کرنا برطانوی توسیع پسند پالیسی کا حصہ تھا جس میں بلوچ قوم یا ان کی سرزمین کی خیر خواہی اور بھلائی کا کوئی مقصد شامل نہ تھا۔

اس بحث سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ گرانٹ، پوٹینگر اور کرسٹی اور دیگر برطانوی فوجی جاسوسوں کو انتہائی مکروہ اور مذموم مقاصد کی خاطر بلوچستان بھیجا گیا تھا اور انہوں نے اپنے مقاصد سے بھی کئی زیادہ مکروہ اور مذموم کام کئے۔ پوٹینگر نے بلوچ براہوئی زبان میں فرق کو محسوس کرتے ہوئے انتہائی مکاری کے ساتھ انہیں الگ الگ نسلی گروہوں میں تقسیم کر کے آپس کی تفریق میں ڈالنے کی

کوشش کی۔ جو اتنا مذموم عمل تھا کہ اس کے منفی اثرات مرتب ہونے سے پورا بلوچستان جل اٹھتا۔ اس تاریخی حقیقت کو کہ لفظ براہوئی کا بحیثیت قوم بلوچستان میں کوئی تصور نہ تھا اور زبان کی حد تک محدود تھا۔ یہ لفظ پوٹینگر سے قبل (غالباً) کسی مصنف نے استعمال نہیں کیا تھا اور خوانین قلات براہوئی خانوادہ سے ہونے کے باوجود اپنے ساتھ بلوچ اور خان بلوچ تحریر کرتے تھے۔ مگر پوٹینگر نے ان حقائق کو یکسر جھٹلایا اور یہ بھی تسلیم نہیں کیا کہ خود ان کے اسلاف (سکندر اعظم کے مورخ ایرین) نے لفظ اربوئی کو ہزاروں سال قبل سطح مرتفع جھلاوان وقلات کے قبائل، ان کے خطے اور ان کے آبی وسائل کے لئے استعمال کیا تھا مگر پوٹینگر نے یہ لفظ صرف ایک تفریحی مقام تک محدود کر کے اس کے معانی تک تبدیل کئے۔ علاوہ ازیں کئی ایسی رسموں اور عادتوں کا تذکرہ کر کے بلوچ قبائل کو غیر مہذب ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جن کا بلوچ قبائل میں دور دور تک شائبہ تک نہیں ملتا۔

اس بحث سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ بلوچوں کی نسلی اصلیت کے بارے میں شکوک وشبہات اور غلط فہمیاں بھی انہی برطانوی جاسوسوں اور ایجنٹوں کی پیدا کردہ تھیں۔ انہوں نے آپس میں اختلافی نظریے پیش کر کے آنے والے محققین کے لئے مشکلات پیدا کیں۔ بحث سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ان برطانوی جاسوس مورخین میں سے چند ایک نے بلوچوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی خاطر ان کی نسلی اصلیت کو انتہائی مبالغے کے ساتھ بیان کیا اور ان کا رشتہ قدیم حکمران خاندانوں کے ساتھ ملایا جیسا کہ پروفیسر راؤلنسن، اور بعض دیگر نے انتہائی لغویات بیان کئے۔ مگر ان کی تعریفیں اور لغویات دونوں بلوچوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئیں اور صدیاں گذر جانے کے باوجود آج بھی بلوچ

مورخین بلوچوں کے نسلی یا قومی تعلق کے لئے کسی ایک نظریے پر متفق نہیں ہیں۔ ہر بلوچ مورخ دیگر بلوچ مورخین سے اختلاف رکھتا ہے اور بعینہٖ انگریزوں کی طرح ان کا رشتہ عظیم حکمرانوں سے ملاتا ہے اور ہر مورخ انہیں باہر سے آنے والا گروہ قرار دیتا ہے۔ یہی شکوک وشبہات انگریزوں کی پیدا کردہ تھیں اور اسی نظریاتی اختلاف کو تاریخ پر وار کرنا کہتے ہیں۔ تا کہ ایک قوم اپنی سابقہ تاریخ کی تلاش میں ایسے سرگردان ہو جائے کہ وہ مستقبل کے بارے میں کبھی بھی نہ سوچ سکے اور آج یہی حالت بلوچ قوم اور بلوچ مورخین کی ہے۔

ان برطانوی جاسوسوں نے اولاً بلوچستان کی تاریخ کو یونانی دور تک قدیم بتایا اور اس کا معاشرتی ارتقائی سفر کا دورانیہ محدود کرنے کی کوشش کی مگر بعد ازاں خود انہی غیر ملکیوں نے بلوچستان کی قدیم اور حجری دور کی باقیات کا کھوج لگا کر بلوچستان کے معاشرتی ارتقائی سفر کو تقریباً 11 ہزار سال قدیم بتا کر نہ صرف یہ کہ دنیا کو ششدر و حیران کر دیا بلکہ ابتدائی برطانوی نظریات کی بھی نفی کر دی۔

اس موضوع پر گذشتہ اوراق میں کی جانے والی بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ برطانوی جاسوسوں نے خود اپنے ملک کی قوانین کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور ایسے موضوعات پر تحریر کیا کہ جن کا انہیں اختیار حاصل نہیں تھا اور ان سے ایسے انسانی جرائم سرزد ہوئے کہ جن کی سزا انتہائی سنگین ہوتی ہے انہوں نے بلوچستان میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکائی۔ ہزاروں انسان اس خانہ جنگی کی نذر ہو گئے۔ ہزاروں گھر برباد ہوئے۔ ایک قدیم قبائلی اور پر امن معاشرے میں دراڑیں پڑ گئیں۔ پورا ملک انارکیت کا شکار رہا۔ ایک قومی حکمران کی حکمرانی پر غاصبانہ طور پر قبضہ کیا گیا۔ ایک ایسا ملک کہ جس نے کبھی بھی برطانیہ کے ساتھ

کوئی تلخ کلامی تک نہیں کی تھی اسے اپنے قبضہ وتحویل میں لے لیا گیا۔ ایک آزاد اور خود مختار اور دنیا کی قدیم ترین تہذیب کے وارثوں کو وحشی، ڈاکو اور غیر مہذب کہا اور لکھا گیا۔ اس قدیم قوم کو کہ جو ہزاروں سالہ قدیم تاریخ کی حامل ہے، تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی اور اپنے طور پر ان کا رشتہ مختلف خاندانوں سے بغیر تحقیق کے جوڑا گیا۔ حتیٰ کہ ہر طرح کی اخلاقی تہذیبی اور انسانی جرائم کے مرتکب ہوئے۔ انہوں نے ایسی غلط فہمیاں پھیلائیں کہ جن سے معاشرت سمیت تاریخ نویسی کے علم کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ انہوں نے من گھڑت اور فرضی دعوؤں اور نظریوں کا ایک ایسا جال پھیلایا کہ جس نے پوری بلوچ قوم کو طویل عرصہ تک اپنی لپیٹ میں لیے رکھا۔ برطانیہ کی بلوچ قوم کی نسلی تاریخ کے متعلق نظریات کی پیروی کرنے کا یہ عالم تھا کہ قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی جیسی قوم پرست اور ریڈیکل جماعت نے بھی راؤلنسن کے بلوچ قوم کے متعلق پیش کردہ کلدانی نظریے سے اتفاق کیا اور تو اور کئی نامور بلوچ مورخین نے بھی راؤلنسن کے نظریے کی پیروی کی۔ یقیناً اگر ان شاطر برطانویوں نے ایسی من گھڑت کہانیاں نہ بنائی ہوتیں اور اولاً یا تو اس موضوع پر خاموش رہتے یا پھر درست سمت میں تحقیق کرتے تو آج کا بلوچ مورخ بلوچوں کی نسلی تاریخ کی تلاش میں نہ تو سرگرداں ہوتا اور نہ ہی انگریز کا پیروکار۔

اس تمام تر بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انگریزوں کی اس سازش نے ان کی فنِ تاریخ نویسی کی دانش کا یہ پول بھی کھول دیا کہ وہ بلوچستان کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔ اے۔ ڈبلیو ہیوز کا بیان کردہ بلوچستان کا کل رقبہ اس کی واضح مثال ہے دراصل ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ ہر حوالے سے بلوچستان کے

بارے میں غلط فہمیاں پیدا کر کے نہ صرف اس کی تاریخ بلکہ جغرافیہ ،معاشرہ ، تہذیب ، تمدن ،حکمرانی ، خودمختاری ، آزادی سب کچھ تباہ کر دیا جائے۔ برطانوی جاسوس چونکہ کئی محاذوں پر کام کررہے تھے کچھ وہ جوان کی حکومتوں نے انہیں تفویض کی تھیں اور کچھ وہ جن کو انہوں نے خود چنا تھا ، لہٰذا کئی حوالوں سے ان کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہوئی اور کچھ مقاصد میں وہ ناکام رہے۔ وہ دین مسیح یہاں کے مسلمان بلوچوں میں پھیلانے میں ناکام ہوئے مگر ان کی زبان وادب پر ان کا داؤ مثبت پڑا۔ بلوچوں کو قومی بنیادوں پر یا نسلی حوالے سے تقسیم کرنے کا ان کا مذموم مقصد ناکام ہوا اور بلوچ قبائل نے ڈینس برے کی بلوچ براہوئی تقسیم کے نظریے کورد کر دیا مگر بلوچوں کے نسلی تقسیم ،جغرافیائی حدود کی غلط بیانی ، وغیرہ میں انہیں اس حد تک کامیابی ملی کہ مستقبل کا کوئی بھی بلوچ مورخ بلوچوں کی تاریخ اور جغرافیائی حدود کے نقطے پر متفق نہ ہوسکا۔

اس سے قبل مورخین نے ہمیشہ برطانوی مقاصد اور اسکی توسیع پسندانہ پالیسی کو زیر نظر رکھا اور یہی ہمیشہ تحقیق کا عنوان رہا۔ مگر کسی نے برطانیہ کو اس مقام تک راستہ دکھانے والوں یعنی جاسوسوں کے مقاصد پر تحقیق نہیں کی کہ وہ کس طرح اپنے تفویض کردہ اختیارات سے تجاوز کر گئے تھے اور انتہائی نازک اور خطرناک موضوعات پر کام کررہے تھے کہ جن کے انتہائی تباہ کن اثرات پڑ سکتے تھے۔ ان جاسوسوں کی تحریروں نے نہ صرف یہ کہ برطانوی افواج کی راہنمائی کی بلکہ یہاں کے لوگوں کے لئے تباہی وبربادی اور شکستگی کا تحفہ بھی لے کر آئے۔

اس میں شک نہیں کہ انگریزوں نے بلوچ وبلوچستان کے موضوع پر کافی اہم مواد فراہم کیا ہے۔ جس کی دیکھا دیکھی مقامی سطح پر زبان وادب اور تاریخ نویسی کا

سلسلہ شروع ہوا مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ برطانیہ ہی وہ اول ملک تھا کہ جس کے جاسوسوں، ایجنٹوں اور گماشتوں نے بہروپ بدل کر بلوچستان کی سیاحت کی اور یہاں کے باشندوں اور ان کے ملک کے بارے میں تحریر کیا بلکہ ان سے قبل عرب اور فارسی بولنے والے لاتعداد سیاح اس خطے میں آئے اور یہاں کے باشندوں اور ان کے خطہ زمین کے بارے میں تفصیلات فراہم کیں اور بذات خود بابائے تاریخ ہیروڈوٹس نے بھی 480 ق م کے لگ بھگ یہاں کی سیاحت کی تھی اور ابتدائی معلومات فراہم کی تھیں۔ عربوں اور فارسی سیاحوں کا کام بھی کافی اہم ہے۔ ان عربوں میں المسعودی، ابن حوقل، طبری، ابن خلدون، ابن مسکویہ، عبداللہ یاقوت، ابن خرداذبہ، ناصر خسرو، البیرونی، البلاذری، المقدسی، المسعودی، ابنِ رستہ، عبدالکریم شہرستانی اور کئی دیگر شامل ہیں اور وہ اپنی تصانیف میں بلوچستان سے متعلقہ ابواب میں بلوچوں کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اپنی توسیع پسندانہ مفادات کی خاطر انہیں کوچ وبلوچ قبائل میں تقسیم کرتے ہیں جس کا واضح مقصد یہی تھا کہ انہیں آپس میں تقسیم کر کے ان پر باآسانی قابو پایا جا سکے یا پھر بغض وحسد کی بنا پر انہیں کوچ وبلوچ کہا اور لکھا، یا پھر فردوسی کی طرح اشعار کا وزن برابر کرنے کی خاطر یا انہیں مشترکہ طور پر خانہ بدوش، وحشی، پہاڑی وصحرائی باشندے وغیرہ قرار دیکر کوچ وبلوچ تحریر کرنا ان کا مقصد تھا۔

بالکل اسی طرح انگریزوں نے بھی پہلاوار بلوچوں کی قومی تقسیم پر کیا اور انہیں براہوئی اور بلوچ قبائل میں تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ اب ایک ایسی قوم کہ جو اس خطے میں کسی نیک نیت سے نہیں آئی بلکہ یہاں کے وسائل پر قبضہ کرنے اور یہاں کے باشندوں کو غلام بنانے کا عزم لے کر آئی تھی اور جس نے یہاں کی تاریخ، سیاست وحکومت، جغرافیائی خدوخال، معاشی نظام اور معاشرت تباہ کی۔ بلوچ قوم

اوران کے وطن کو تقسیم کرنے کا ارتکاب کیا اور ہر طرح کے اخلاقی وتہذیبی جرم سے اپنے آپ کو آلودہ کیا، تو اسکی لکھی ہوئی تحریروں پر کون یقین کرسکتا ہے۔ یقیناان کی تحریریں بلوچ وبلوچستان کے لئے زیادہ خوش آئند اور مفید نہیں تھیں بلکہ ان کی تحریروں سے بلوچستان کے جغرافیہ اور قومی تقسیم کا عمل شروع ہوا اور بلوچ عوام زبوں حالی اور غلامی کا شکار ہوگئے۔افسوس اس امر پر ہوتا ہے کہ بلوچ وبلوچستان کے موضوع پر لکھنے والے بیشتر مورخین نے اپنی کتابوں کی تحریر کرنے اور کسی نظریہ سے اتفاق کرنے یا نیا نظریہ قائم کرنے کیلئے انہی انگریزی مواد سے استفادہ کیا۔ گو کہ بلوچستان کے بڑے مورخین محمد سردار خان بلوچ، میر گل خان نصیر، میر احمدیار خان، مولانا نوراحمد فریدی، محمد سعید دہواراور جسٹس میر خدابخش بجارانی مری وغیرہ نے دیگر زبانوں کے مواد سے بھی استفادہ کیا ہے مگر چونکہ انگریز مورخین کے دیئے ہوئے نظریوں کا عکس ہمیشہ ان کے ذہنوں میں ہوتا تھا اور زیادہ تر عربی یا کلدانی نظریہ انہیں زیادہ معقول نظر آتا تھالہذا دیگر زبانوں کے مواد کا مطالعہ کرنے کے باوجود کہ جو انگریزی نظریوں سے بالکل مختلف ہیں انہوں نے کسی نہ کسی برطانوی مورخ کے نظریے سے اور خصوصاً پروفیسر راؤلنسن سے استفادہ واتفاق کیا ہے۔

ہمارے فاضل مورخین یہ جانتے بھی تھے کہ انگریز انہیں الجھا رہے ہیں اور انہیں لاحاصل مباحث میں ڈال کران کی توجہ اصل مقاصد سے ہٹا رہے ہیں مگر اس کے باوجود ہمارے مورخین ان کی سازشوں کا شکار ہوگئے اور بجائے اس کے کہ قوم کو کوئی ایک نظریہ دے کراس پر متفق کرتے انہوں نے قوم کو نئے نئے نظریوں کا تحفہ دے کر مستقبل میں مزید الجھنوں کا شکار بنادیا۔آج جب کوئی مورخ بلوچ قوم کی قومی اصلیت یا نسلی ماخذ اور بلوچستان کے قدیمی اور حقیقی جغرافیہ کے بارے میں تحقیق

کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے یہ تمام موضوعات کہ جن پر بے شمار کام بھی ہو چکا ہے سخت الجھے ہوئے نظر آتے ہیں ان میں سے بیشتر مواد یا تو حقائق سے بالکل ہٹ کر ہیں یا پھر حقائق کو مسخ کر کے پیش کیے گیے ہیں۔ لہٰذا محقق محسوس کرتا ہے کہ ان تمام کتابوں کے حوالوں کے باوجود ان سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ برطانیہ سمیت کسی بھی غیر ملکی مورخ نے بلوچستان کے بارے میں تمام حقائق کو کبھی بھی آشکارا نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے اس خطے کے باسیوں کی بے شمار خوبیوں کا ذکر کیا۔ ان کی مہمان نوازی، تحفظ، امداد، سادگی، بردباری، دلیری وغیرہ سے تو استفادہ کیا اور لطف اندوز ہوئے مگر جاتے جاتے انہیں ظالم، وحشی، لیٹرا اور غیر مہذب تحریر کیا۔

موجودہ دور میں ایک نئے انکشاف نے یورپ کے مورخین کی دانش اور غیر جانبداری کا پول کھول دیا۔ سواستیکا کا مشہور زمانہ نشان جو آج تک آرین نشان کے طور پر یورپ بلکہ دنیا بھر میں جانا جاتا تھا اور جرمن اقوام اسے اپنے قومی اور جنگی نشان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جو نازی پارٹی کے پرچم پر بھی بنایا گیا تھا اور اُن کا نیشنل سیمبل تھا۔ اسے پہلے پہل یورپی اقوام نے ہی آرین نشان قرار دیا تھا اور اسے اختیار کیا تھا۔ مگر بلوچستان میں مہر گڑھ کے آثار قدیمہ سے برآمد ہونے والی کئی قدیم (لگ بھگ 3500 ق م) کے ادوار کی اشیاء مثلاً برتنوں، مہروں اور تعویذات وغیرہ پر اس نشان کی موجودگی نے یورپ کے اس دعوے کو باطل قرار دے دیا۔ کیونکہ آرین کا دور 1500 ق م تھا جبکہ یہ نشان ان سے 2000 سال سے بھی زیادہ عرصہ قبل مہر گڑھ میں زیر استعمال تھا مگر یورپی اقوام اور دانشوروں نے اس کو آشکارا نہیں کیا اور نہ ہی اس پر بحث مباحثے کیے، حالانکہ مہر گڑھ دریافت کرنے والا محقق جین فرانکوئیس جیرج یورپ (فرانس) کا باشندہ ہے۔

درج بالا مثال کی اس باب میں تذکرے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تا کہ اس بات کی وضاحت ہو سکے کہ یورپی اقوام کبھی بھی ہمارے آباؤ اجداد اور خطہ زمین کے بارے میں جتنا علم رکھتے ہیں ہمیں کبھی بھی نہیں دیں گے بلکہ وہ اپنے مفادات کو ترجیح دیں گے۔

ضرورت اب اس امر کی ہے کہ بلوچستان کی قدیم تاریخ اور اس کے باشندوں کے بارے میں جو اغلاط کتب تواریخ اور بالخصوص برطانوی مواد میں موجود ہے انہیں حقائق کی روشنی میں پرکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ برطانوی عزائم کی کس قدر عکاسی کرتی ہیں اور ان کے اندر کون کون سی سازشیں چھپی ہوئی ہیں یقینا عمیق و دقیق مطالعہ سے اصل حقائق ضرور سامنے آئیں گے اور ویسے بھی جدید تحقیق نے کئی برطانوی نظریات کو باطل قرار دیا ہے اور ان جاسوسوں کے اصل عزائم کو آشکارا کیا ہے۔ بلوچستان کی تاریخ سے حقیقی معنوں میں دلچسپی رکھنے والے قارئین جانتے ہیں کہ برطانیہ ایک فاتح تھا اور اسکی فوجوں نے سخت مزاحمت کے بعد قلات پر قبضہ کیا تھا اور بعد ازاں بھی اس کے تقریباً سوسالہ دور میں قدم قدم پر اس کے خلاف مزاحمت ہوئی تھی اور اس کے مفادات کو سخت نقصان پہنچایا گیا تھا لہٰذا ممکن ہی نہیں کہ برطانیہ کے وہ مورخین کہ جنہوں نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران یہاں جاسوسی یا قبضہ کرنے کے بعد ملازمت کی اور انہوں نے فاتح کی حیثیت سے مفتوح کی تاریخ لکھی، اپنا ملکی مفاد چھوڑ کر یہاں کے لوگوں کو راست بتائیں یا یہاں کی حقیقی تاریخ تحریر کریں۔ یقینا انہوں نے اپنی توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل اور سامراجی مقاصد کے حصول کی خاطر تحریریں لکھیں تا کہ انکا "یونین جیک" ہر طرف لہراتا ہوا نظر آئے۔

کتابیات

1. آلیور، ایڈ ورڈ، ای، اے کراس دی بارڈر لینڈ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2000

2. آلیور، ایڈ ورڈ، ای، پٹھان اور بلوچ، مترجم، ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1984

3. ای مارسڈن، تاریخ ہند، بک ہوم، لاہور، 2006

4. براوی، عزیز اللہ عزیز، ماہنامہ اولس، اسلام آباد، مارچ اپریل، 1986

5. براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور حکومتیں، زمرد پبلیکیشنز، مستونگ، 1998

6. بروس، رچرڈ آئزک، فارورڈ پالیسی اینڈ اٹس رزلٹس، بک ورلڈ، کوئٹہ، 2002

7. بلوچ، حمید، مکران، سید ہاشمی اکیڈیمی، کراچی، 2008

8. بلوچ، عنایت اللہ، دی پرابلم آف گریٹر بلوچستان، اے کیس سٹڈی آف بلوچ نیشنل ازم، سٹٹ گرٹ، جی ایم بی ایچ، جرمنی، 1987

9. بلوچ، فاروق، بلوچ اوران کا وطن، فکشن ہاؤس، لاہور، 2012

10. بلوچ، فاروق، خان اعظم میر نصیر خان نوری، حکومت، سیاست، کردار اور شخصیت، فکشن ہاؤس، لاہور، 2012

11. بلوچ، فاروق، مہر گڑھ، ایشیاء کی تہذیب میں اس کی اہمیت، بلوچستان سٹڈی سینٹر، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، 2011

12. بلوچ، محمد سردار خان، ہسٹری آف بلوچ ریس، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1958

13. پوٹینگر، ہنری ، ٹریول ان سندھ اینڈ بلوچستان، مترجم: پروفیسر ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1983 ،سیکنڈ ایڈیشن

14. تھارنٹن ،ہنری ، کرنل سر رابرٹ سنڈیمن ،نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1977

15. ٹیٹ، جی۔ پی، کنگڈم آف افغانستان ، انڈس پبلیکیشنز، کراچی، 1973

16. خان، میر احمد یار، تاریخ خوانین بلوچ، اسلامیہ پریس، کوئٹہ، 1974

17. خان، میر احمد یار، تاریخ قوم بلوچ و خوانین بلوچ، العصر پبلیکیشنز، لاہور، 2007

18. دہوار، محمد سعید، تاریخ بلوچستان ،نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1990

19. ڈیمز، لانگ ورتھ، پاپولر پوئیٹری آف بلوچیز، بلوچی اکیڈیمی، کوئٹہ، 1988

20. رومان، ایم انور، پروفیسر، کوئٹہ قلات کے براہوئی ،مترجم، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، قریشی پبلیکیشنز، کوئٹہ، 1987

21. ریورٹی، ایچ ۔ جی، سرزمین افغان و بلوچ، مترجم: پروفیسر سعید احمد خالد، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1999

22. سٹرینج، جی۔لی، جغرافیہ خلافت مشرقی، مترجم: محمد جمیل الرحمان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1986

23. سراج، منہاج الدین ،مولانا ،طبقات ناصری، انگریزی ترجمہ، ایچ ۔ جی ۔ ریورٹی ، ایشیاٹک سوسائیٹی ، کلکتہ، انڈیا، 1995 ،سیکنڈ ایڈیشن

24. سعد، ابن محمد، طبقات ابن سعد، مترجم : علامہ عبداللہ العماری ،نفیس اکیڈمی، کراچی ، 1972

25. سمتھ، ونسنٹ اے، قدیم تاریخ ہند، ترجمہ: مولانا محمد جمیل الرحمان، تخلیقات ،لاہور، 2001

26. صدیقی، احمد حسین، گوہر بحیرہ عرب (کراچی) محمد حسین اکیڈمی، فیڈرل بی ایریا، کراچی، 1995

27. کمبرانی، آغا نصیر خان احمدزئی، تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد اول) بلوچی اکیڈیمی، کوئٹہ، 1982

28. گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1990

29. گورنمنٹ ریکارڈ، بلوچستان تھرو دی ایجیز، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 1984

30. گورنمنٹ ریکارڈ، بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر (لسبیلہ)، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1997

31. گورنمنٹ ریکارڈ، دی قلات افیئرز، گوشہ ادب، کوئٹہ، 1977

32. لاک ہارٹ، لارنس، نادر شاہ، مترجم، طاہر منصور فاروقی، تخلیقات، لاہور، 2007

33. لینن، اقوام مشرق کی تحریک آزادی، فکشن ہاؤس، لاہور، 2007

34. لہڑی، صالح محمد خان، ملک، تاریخ بلوچستان ون یونٹ تک، ہفتہ وار باغ و بہار، کوئٹہ، 1952

35. مارکس، کارل، ہندوستان کا تاریخی خاکہ، تخلیقات، لاہور، 2002

36. مری، شاہ محمد، بلوچ قوم، قدیم عہد سے عصر حاضر تک، تخلیقات، لاہور، 2000

37. مری، میر خدا بخش بجارانی، جسٹس، بلوچی کہنیں شاعری، بلوچی اکیڈیمی، کوئٹہ، 1974

38. میک کرنڈل، انویژن آف انڈیا بائے الیگزینڈر دی گریٹ، انڈس پبلیکیشنز، کراچی، 1982

39. میگ گریگر، ونڈرنگز ان بلوچستان، انڈس پبلیکیشنز، کراچی، 2003، سیکنڈ ایڈیشن

40. نصیر، میر گل خان، تاریخ بلوچستان، قلات پبلشرز، کوئٹہ، 2000

41. نصیر، میر گل خان، کوچ و بلوچ، سیلز اینڈ سروسز، کوئٹہ، 1999

42. ہیرلڈ لیم، سکندر اعظم، مترجم، غلام رسول مہر، فکشن ہاؤس، لاہور، 2006

43. ہیوز، اے ڈبلیو، دی کنٹری آف بلوچستان، سیلز اینڈ سروسز، کوئٹہ، 2002

44. ہیوز، اے ڈبلیو، سرزمین بلوچستان، مترجم، ایم انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، 2011، سیکنڈ ایڈیشن